پیر بابا
Pakistanipoint
Waqar
Azeem
روشنی بخاری

پیر بابا

روشنی بخاری

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

عبداللہ اکیڈمی
الکریم مارکیٹ۔ اُردو بازار، لاہور (پاکستان)
فون: 0423-7230350 فیکس: 009+42-37241382
موبائل: 0345-4061241 0344-4422336
E-mail: abdullahacademy@gamil.com

ترتیب

☆☆☆

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

پیر بابا

Pakistanipoint
Waqar Azeem

آصف نے گاڑی ڈسٹرکٹ جیل کے باہر روکی اور پھر اتر کر ڈِگی کھولنے لگا۔

اب وہ ڈِگی میں سے مختلف شاپنگ بیگ نکال رہا تھا جن میں چاول، دالیں، سیب، خشک دودھ کے پیکٹ، کوئلے اور ایسی ہی کچھ دوسری چیزیں بھی شامل تھیں۔

ساری چیزیں نکال لینے کے بعد اس نے ڈِگی بند کی۔ گاڑی کے شیشے چڑھا کر گاڑی لاک کی اور پھر جیل کے اندرونی احاطے کی طرف بڑھ گیا۔ ایک جگہ سے اس نے سیمنٹ کی بوریوں سے بنائے گئے خاکی کاغذ کے کچھ خالی لفافے خریدے اور پھر شاپنگ بیگز میں موجود سارا سامان ان لفافوں میں منتقل کرنے لگا۔

اس کے بعد وہ اس پولیس والے کی طرف بڑھا جس کے سامنے ایک لمبی قطار لگی ہوئی تھی اور وہ کرسی میز ڈالے بیٹھا سب کو پرچی کاٹ کاٹ کر دے رہا تھا۔ آصف بھی قانون کے مطابق قطار میں لگ گیا۔ کافی دیر کے بعد اس کی باری آئی تو وہ پولیس مین کے قریب پہنچ گیا۔

''نام......؟'' پولیس والے نے سر اٹھائے بغیر کہا۔

''سیما......!'' اس نے جواب دیا۔

''ولدیت......؟'' پولیس والے نے دوسرا سوال کیا تو آصف کے ہونٹوں سے آزاد ہونے والے الفاظ تھے۔

''غلام حسین......!''

''بیرک نمبر......؟'' پولیس والے نے سر اٹھائے بغیر اپنے مخصوص انداز میں دہرایا۔

''تین......!'' آصف کے جواب دینے پر پولیس والے نے ایک پرچی پھاڑ کر آصف کے ہاتھ میں تھما دی۔ اب آصف کا رخ اسی جانب تھا جدھر اس سے پہلے پرچی حاصل کرنے والے سب لوگ جا رہے تھے۔ یہاں ایک سلاخ دار دروازہ تھا جس کے باہر ایک باوردی پولیس والا ہاتھ میں گن پکڑے مستعد کھڑا تھا۔

سب لوگ اس کے اردگرد جمع تھے۔ لٰہذا وہ بھی کھڑا ہو گیا۔ تقریباً دس منٹ کے بعد اس نے دروازہ کھولا تو سب لوگ جلدی جلدی اندر داخل ہونے لگے۔ آصف نے بھی ان کی تقلید کی اور وہ بھی اس تنگ راہ داری نما کمرے میں داخل ہو گیا جس کے سامنے کے رخ پر دائیں سے بائیں ایک طویل جالی لگی ہوئی تھی۔

کمرے کے ایک کونے میں ایک اور سلاخ دار دروازہ نظر آ رہا تھا جو شاید جیل کی اندرونی سمت میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کے باہر بھی باوردی پہرے دار موجود تھا جو کرسی رکھ کر بیٹھا تھا اور اس کے اردگرد خاکی لفافوں کا ڈھیر سا لگا ہوا تھا۔

بالکل ویسے ہی لفافے جو اس وقت آصف نے اٹھا رکھے تھے، آصف بھی اسی سمت بڑھ گیا۔ اس نے وہ لفافے اس پولیس والے کے سامنے رکھے تو اس نے پہلے پولیس والے کی طرح سوال کیا۔

''نام......؟''

اور ایک مرتبہ پھر اسی انداز میں آصف نے نام، ولدیت اور بیرک نمبر بتایا تو پولیس والوں نے اٹھ کر یہی معلومات لفافوں پر درج کر دیں۔

اس کے بعد آصف جالی کی طرف متوجہ ہوا اور پھر ایک جگہ جالی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ ٹھیک اسی لمحے جالی کے اندرونی جانب ایک دروازہ کھلا اور پھر بھانت بھانت کی خواتین شیڈ میں داخل ہونے لگیں۔

بالکل بھیڑ بکریوں کی طرح...... کچھ ہی دیر میں شیڈ کھچا کھچ بھر گیا۔ آصف کی متلاشی نظریں تھیں شیڈ میں داخل ہونے والی سولہ سترہ سال کی وہ خوب صورت لڑکی جس نے ایک نومولود بچہ اٹھا رکھا تھا۔ حسن و خوب صورتی کا وہ شاہکار اس وقت کملائی ہوئی حالت میں تھا۔

لمبے سیاہ بال، تیکھے نقوش، بڑی بڑی اُداس لیکن جھیل سی گہری آنکھیں جن میں ایک عجیب سی کشش تھی۔ سرخ و سپید رنگت لیکن اس وقت اس کے رخساروں پر زردی کھنڈی ہوئی تھی۔ اس نے بھی شاید آصف کو دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ سیدھی اس کے سامنے آ کر رکی تھی اور پھر ایک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ آصف بھی خاموشی سے اسے تکتا رہا پھر لڑکی کے ہونٹوں میں ارتعاش سا پیدا ہوا اور اس کی آواز بلند ہوئی۔

''وکیل صاحب......! کیوں کرتے ہیں یہ سب......؟ آخر اس کی ضرورت ہی کیا ہے......؟ میں تو آپ کے احسانوں کا بدلہ بھی نہیں اتار سکتی۔''

یہ کہہ کر وہ سسکنے لگی اور دو موٹے موٹے آنسو اس کے رخساروں پر لڑھک آئے۔ آصف کا دل بے اختیار چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے آنسو پونچھ ڈالے لیکن وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا کیونکہ لوہے کی مضبوط جالی ان دونوں کے درمیان حائل تھی اور جالی نہ بھی ہوتی تو بھی شاید وہ یہ جرأت نہ کر پاتا۔ بھلا اس کا اس سے رشتہ بھی کیا تھا......؟ وہ صرف اس کی ایک کلائنٹ تھی اور کلائنٹ بھی ایسی جس کا مقدمہ لڑنے کی اس نے کوئی فیس نہیں لی تھی۔

اس نے بہت کوشش کی تھی کہ عدالت سیما کو بری کر دے لیکن اس کی سر توڑ کوشش کے باوجود ایسا ہو نہیں پایا تھا اور اسے سات سال قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی تھی۔ آخر ایک انسانی جان ضائع ہوئی تھی۔ بہر حال جو بھی تھا ایک بات طے تھی کہ کیس لڑنے کے دوران آصف اس لڑکی سے بری طرح متاثر ہو چکا تھا۔ اس کی کہانی عجیب و غریب تھی۔ اس کا کیس اسے مجرم ثابت کر رہا تھا لیکن آصف اپنے دل کا کیا کرتا......؟ وہ تو عجیب سے انداز میں دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ لڑکی کا رکھ

لمحات، اس کے بات کرنے کا انداز، اس کی معصومیت یہ سب آصف کی سوچوں میں ہلچل مچانے کے لئے کافی تھا۔ اس کے سینے میں چپکے چپکے کچھ اور ہی جذبات پرورش پانے لگے۔

اور آصف جو پچیس سالہ خوب صورت جوان اور ایک ہوشیار وکیل بھی تھا، اس کی ساری ہوشیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ کیس تو وہ ہارا ہی تھا لیکن ساتھ ہی اپنا دل بھی ہار بیٹھا تھا۔ اس کی وکالت کو شکست ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی جوانی جیت چکی تھی۔ اس نے بار بار خود کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن بے سود...... اس کا دل جوانی کی لے پر رقص کناں تھا اور دھڑکنیں بھی اسی کے گیت گانے لگی تھیں لیکن ان سب باتوں کے باوجود ایک کامیاب وکیل ہوتے ہوئے بھی وہ سیما سے ابھی تک اپنے جذبات کا اظہار نہیں کر سکا تھا۔

یہ رعب حسن تھا یا شاید سیما کی مظلومیت کا احساس...... یا شاید احساس ندامت کہ وہ اسے بچا نہیں پایا تھا، جو کچھ بھی رہا ہو حقیقت یہی تھی کہ جب جب وہ سیما کا سامنا کرتا تھا، اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دیتی تھی اور وہ چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کہہ پاتا تھا۔

پچھلے ایک سال سے اس کی یہی روٹین تھی کہ وہ باقاعدگی سے ہر ہفتے سیما سے ملاقات کے لئے آتا تھا اور بساط بھر اس کی ضرورت کی تمام چیزیں اسے پابندی سے پہنچاتا تھا۔

سیما کے گھر والے تو پتا نہیں اس سے ملاقات کے لئے آتے تھے یا نہیں، وہ ضرور آتا تھا۔ اب بھی وہ اس کے سے کہنا چاہتا تھا کہ

"سیما......! یہ سب میں اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہی تو کر رہا ہوں، جس پیار کا تعاقب تمہیں جیل کی چار دیواری تک لے آیا ہے اس سے کئی گنا محبت میں تمہیں دینا چاہتا ہوں۔ تمہیں دنیا کی ہر وہ خوشی دینا چاہتا ہوں جو آج تک تمہیں نہیں مل سکی۔ تمہارے دکھ بانٹنا چاہتا ہوں۔ اگر میں یہ سب کرتا ہوں تو تمہیں اس پر

اعتراض کیوں ہے......؟

یہ سب میں تمہارے لئے نہیں اپنے لئے ہی تو کرتا ہوں۔ میرے دل کو اس سے خوشی ملتی ہے اور پھر تم مجھ سے الگ کب ہو......؟ میری ذات کا ایک حصہ ہی تو ہو تم ایک اٹوٹ انگ......'' لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکا اور ہکلاتے ہوئے بولا۔

''سس...... سیما...... تم...... تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں......! مم...... میرا مطلب ہے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں......؟'' اسے اپنے سوال کی بے ربطگی کا احساس ہوا تو گڑبڑائے ہوئے سے انداز میں اس نے بات سنبھالنے کی کوشش کی۔

بھلا آزاد فضاؤں میں اڑنے والے ایک پنچھی کے پر کاٹ کر اسے پنجرے میں قید کر دیا جائے تو اس سے بڑی تکلیف اس کے لئے اور کیا ہوگی......؟ جیل میں بند رہنے والے کسی شخص سے یہ پوچھا جائے کہ تمہیں یہاں کوئی تکلیف تو نہیں......؟ بھلا اس سے بڑا احمقانہ سوال اور کیا ہوگا......؟ اور وہ یہ سوال کرنے کے بعد دل ہی دل میں بری طرح شرمندہ ہو رہا تھا۔

لیکن سیما کا لہجہ اعتماد سے بھرپور تھا۔

''نہیں وکیل صاحب......! مجھے کوئی پریشانی نہیں...... میں اپنے کئے پر نادم نہیں ہوں اور نہ ہی اس سزا سے خائف ہوں۔ میرے دن کٹ رہے ہیں اور کٹ ہی جائیں گے اور پھر آپ کے احسانات بھی تو ساتھ ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز بلکہ میری ضرورت سے کچھ زیادہ ہی آپ مجھے پہنچا دیتے ہیں پھر بھلا تکلیف کیسی......؟ ہاں......! یہ بات ضرور پریشانی کرتی ہے کہ آپ یہ سب کیوں کرتے ہیں......؟ میں تو اس کے بدلے میں آپ کو کچھ بھی نہیں دے سکتی...... شاید دعائیں بھی نہیں کہ میری تو شاید دعائیں بھی کسی کے کچھ کام نہ آسکیں۔

دُعائیں بے ثمر جانی تو خود اپنے ہی ہاتھوں سے
لبوں پر کانپتی ہر اِک دُعا کا خون کر ڈالا

میں تو...... میں تو شاید کسی کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔'' اور اس کا یہ انداز

دیکھ کر پتا نہیں کیوں آصف کے دل پر جیسے ایک گھونسہ سا لگا۔

''نہیں سیما......! ایسا نہیں کہتے...... دعائیں کبھی خالی نہیں جاتیں اور پھر میں یہ سب کسی صلے کی غرض سے تو نہیں کرتا...... بس میرا دل چاہتا ہے کہ تمہارے لئے جو کر سکتا ہوں وہ کروں، میں تمہیں سزا سے تو نہیں بچا سکا، لیکن یہ سب تو میں کر سکتا ہوں نا......؟ تم یہ مت سوچا کرو کہ میں یہ کیوں کرتا ہوں، کچھ تعلق، کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں غرض اور بدلے کے ترازو میں نہیں تولا جا سکتا نا...... یہ کوئی احسان ہے اور نہ ہی مجھے تم سے اس کا کوئی صلہ درکار ہے، بس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم جلد سے جلد ان سلاخوں سے باہر آ جاؤ......!''

اور سیما کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ کی ہلکی سی لکیر نمودار ہو کر غائب ہوگئی پھر وہ بولی۔

''وکیل صاحب......! سزا تو مجھے ملنی ہی تھی اور یہ کیا کم ہے کہ آپ کی کوششوں کی وجہ سے مجھے پھانسی یا عمر قید کی سزا نہیں ملی۔ صرف سات سال قید کی سزا ہوئی...... اور باہر آ کر میں نے کیا کرنا ہے......؟ زندہ ہی رہنا ہے نا......؟ تو وہ تو میں یہاں بھی جی ہی رہی ہوں پھر اب تو میری تنہائی کا سہارا یہ منا بھی میرے ساتھ ہے، میری زندگی کا مقصد اور محور اب یہی ہے، اچھا ہے کہ یہ اب ظالم دنیا سے دور یہیں رہے۔''

آصف نے کچھ کہنا چاہا لیکن ٹھیک اسی وقت شیڈ میں آواز گونجی۔

''ملاقات کا وقت ختم ہوا۔''

آصف نے جلدی سے کہا۔

''کچھ سامان لایا تھا، وصول کر لینا۔'' اور پلٹ کر جاتی ہوئی سیما نے سر ہلا دیا۔ آصف کے ہونٹوں سے ایک طویل سانس آزاد ہوئی اور پھر وہ بہت سے لوگوں کے تعاقب میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

☆☆☆

ظفر ایک بیس بائیس سالہ خوب صورت نوجوان تھا۔ دبلا، پتلا، پھرتیلا اور چمکدار آنکھوں والا۔ جب وہ سیما کے گھر آیا تو پہلی مرتبہ سیما نے اسے دیکھا۔ سرسری سا انداز تھا لیکن پہلی ہی نظر میں وہ سیما کو اچھا لگا تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ سیما کا خالہ زاد تھا یا شاید اس لئے کہ پہلی مرتبہ ان کے گھر مہمان آیا تھا۔

سیما ایک غریب گھر کی لڑکی تھی اور پورے گاؤں میں ان کا اور کوئی رشتہ دار نہ تھا۔ صرف ایک ہی گھر آباد تھا ان کا اس پورے گاؤں میں، کئی لوگوں کے تو خاندان کے خاندان آباد تھے۔ اس کے باپ کے انتقال کے بعد ددھیال میں سے کبھی کوئی نہیں آیا۔ صرف ایک ہی خالہ تھی جس کے بارے میں سیما نے صرف سن رکھا تھا کہ خالہ صغریٰ شہر میں رہتی ہیں لیکن نہ تو سیما کبھی ان کے گھر گئی تھی اور نہ یہ وہ کبھی ان لوگوں کے گھر آئیں۔

یہ پہلا موقع تھا کہ خالہ صغریٰ اپنے بیٹے کے ساتھ ان کے گھر آئی تھیں اور سیما کو یہ تبدیلی اچھی لگی تھی۔ کسی اپنے کے ہونے کا احساس یقیناً سبھی کو اچھا لگتا ہے۔ وہ لوگ ان کے اپنے تھے اور خاص طور پر ظفر...... وہ تو بہت جلدی سیما سے گھل مل گیا تھا۔ ہنسنا، مسکرانا اور طرح طرح کے لطیفے سنا سنا کر سیما کو بھی ہنسنے پر مجبور کر دینا۔ جیسے اس کا دل پسند مشغلہ تھا اور سیما کو بھی یہ سب بہت اچھا لگتا تھا۔

کچھ ہی دنوں میں وہ ظفر کی اس قدر عادی ہوگئی کہ اگر وہ گھر سے باہر نکل جاتا تو سیما بے چین ہو جاتی اور چلتے پھرتے گھر کے کام کاج کرتے ہوئے بھی اس کی نظریں جیسے دروازے سے چپک کر رہ جاتیں اور ایک دن جب ظفر سارا دن باہر گزار کر شام کو گھر میں داخل ہوا تو سیما اس پر چڑھ دوڑی۔

''یہ کیا طریقہ ہے ظفر......! تمہیں پتا ہے کہ میں صبح سے دروازے کو تک رہی ہوں اور تم ہو کہ تمہیں پرواہ ہی نہیں، جاؤ آج کے بعد میں تم سے بات ہی نہیں کروں گی۔'' سیما نے خفا ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے ارے......! اتنا غصہ......؟ ایسا سلوک تو بیویاں بھی نہیں کرتیں۔''

اور اس کی بات سن کر سیما شرم سے گلنار ہوگئی۔ اس کا سارا غصہ ہرن ہوگیا اور وہ بھاگ کر اندر گھس گئی۔ ظفر نے یہ منظر دیکھ کر معنی خیز انداز میں سر ہلایا اور پھر وہ بھی اندر داخل ہوگیا۔

سیما لوہے کی پیٹی کھولے کھڑی بستر نکال رہی تھی۔ اسے دیکھ کر پیٹی کا ڈھکن اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا اور وہ جلدی سے دوپٹہ درست کرنے لگی۔ ظفر عین اس کے قریب پہنچ کر بولا۔

''سیما......! مجھ سے شادی کرو گی......؟'' اور سیما دھک سے رہ گئی۔

پچھلے کئی دنوں سے وہ اپنے اندر ایک عجیب سی بے چینی، ایک انوکھا سا اضطراب محسوس کر رہی تھی۔

''ظفر......! ظفر......!'' اس کی سوچ ہر وقت اسی کے گرد گھومنے لگی تھی اور آج وہ ظفر کے منہ سے یہ جملہ سن کر اس تبدیلی کی وجہ بھی سمجھ گئی تھی۔ وہ بھی شاید یہی تو چاہتی تھی لیکن اس بے باکی کی توقع شاید نہیں تھی اسے، لیکن بہرحال یہ بات اور ظفر کا یہ انداز اسے برا نہیں لگا تھا۔

''ظفر......! تم باہر جاؤ......! دیکھو امی جان آجائیں گی۔'' اس نے پریشان سے انداز میں کہا تو ظفر نے ایک قدم مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تو کیا ہوگا......؟ اچھا ہے دیکھ لیں گے تو جلدی سوچیں گے۔'' ٹھیک اسی وقت ساتھ والے کمرے سے آنے والی آوازیں سن کر دونوں کی توجہ ادھر مبذول ہوگئی۔

سیما نے غور کیا تو دہل کر رہ گئی، امی جان اور خالہ جان جو پڑوس میں کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں، واپس آ چکی تھیں اور اس وقت دوسرے کمرے میں داخل ہو چکی تھی۔ اگر وہ اس کمرے میں آجائیں تو...... اس نے گھبرا کر سوچا اور پریشان ہوگئی۔ لیکن ظفر ان سب باتوں سے بے پرواہ اسی طرح اس کے قریب موجود تھا۔

''اللہ کا واسطہ......! ظفر......! تم باہر جاؤ......! اگر امی نے اس طرح ہمیں

دیکھا تو وہ کوئی اچھا تاثر نہیں لیں گی۔ تم باہر جاؤ......!'' لیکن ظفر اس وقت پتا نہیں کس موڈ میں تھا کہ اس کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ اس نے آگے بڑھ کر سیما کا بازو پکڑ لیا اور پھر کھینچ کر اسے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''سیما......! میں اب تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' اور سیما اس کی اس حرکت پر لرز کر رہ گئی۔

اسے ظفر کی دیوانگی اچھی بھی لگ رہی تھی لیکن گھر میں امی جان کی موجودگی کا احساس کر کے اس کی روح فنا ہو رہی تھی اور ظفر تھا کہ بے خود ہو رہا تھا اور پھر جس قیامت کا خطرہ تھا، جس سے سیما ڈر رہی تھی، وہ رونما ہو ہی گئی۔

یہ خالہ جان تھیں جو اچانک کمرے میں داخل ہوئی تھیں اور اندر کا منظر دیکھ کر بھونچکی رہ گئی تھیں۔

ظفر سیما کو بازوؤں کے حصار میں لئے کھڑا تھا اور سیما کسی معصوم پرندے کی طرح پھڑ پھڑا کر اس کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ چند ثانیے کے لئے تو ان کی جیسے سمجھ میں ہی کچھ نہ آیا لیکن جب سمجھ میں آیا تو ان کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ غیض وغضب کے عالم میں آگے بڑھیں اور پھر ان کا زناٹے دار تھپڑ ظفر کے گال پڑا۔

تھپڑ لگتے ہی جیسے ظفر کا سارا نشہ ہرن ہوگیا اور سارا عشق جیسے ہوا ہوگیا۔ س نے گھبرا کر سیما کے وجود پر سے اپنے بازوؤں کی گرفت ختم کر دی اور سیما جو نرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی، سرخ چہرے کے ساتھ دوپٹہ درست کرتی ہوئی بلدی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

کمرے سے نکلتے وقت اسے خالہ جان کی دبی دبی غراہٹ سنائی دی تھی۔

''ترے یہ لچھن مجھے کہیں کا نہیں چھوڑیں گے۔''

وہ رات سیما نے کروٹیں بدلتے گزاری۔ ظفر بار بار اس کے دل پر دستک ے رہا تھا اور وہ اپنے دل کا دروازہ اس کے لئے بند نہیں رکھ سکتی تھی۔ وہ اپنا تجزیہ

کر رہی تھی۔ پھر وہ نتیجے پر بھی پہنچ گئی اور نتیجہ یہ تھا کہ ظفر سے الگ رہنا اب اس کے اختیار میں نہ تھا۔ لیکن خالہ جان کا ناقابل فہم رویہ اس کی ساری امیدوں اور ارمانوں پر پانی پھیر رہا تھا۔

کیسا زوردار تھپڑ لگایا تھا انہوں نے ظفر کو......؟ یہ تو شکر تھا کہ امی جان نہیں آئیں ورنہ جو تھپڑ ظفر کو لگا تھا وہ شاید اس کے حصے میں آتا۔ اسے یہ خدشہ بھی پریشان کر رہا تھا کہ کہیں خالہ جان امی سے اس واقعہ کا ذکر نہ کر دیں لیکن خیریت گزری کہ خالہ جان نے ایسا کچھ نہ کیا۔ وہ شاید صرف ظفر ہی کو قصوروار سمجھ رہی تھیں اور حقیقتاً تھا بھی ایسا ہی۔

آج کے اس واقعہ میں سیما کے کسی ارادے کو کوئی دخل نہ تھا۔ ہاں......! اسے ظفر کی یہ جرأت اچھی ضرور لگی تھی اور اس کے بعد سے اس کی دھڑکنوں کا انداز تبدیل ہو گیا تھا۔

وہ ٹھنڈے میٹھے سپنوں میں گم ہو کر رہ گئی لیکن اگلی صبح حیران کن تبدیلیوں کے ساتھ طلوع ہوئی تھی۔ وہ سو کر اٹھی تو اس نے دیکھا کہ خالہ جان واپسی کی تیاری کر چکی تھیں اور امی جان ان کی اس اچانک روانگی پر حیران و پریشان تھیں۔

انہوں نے خالہ جان کو روکنے کی کافی کوشش بھی کی لیکن خالہ جان نے اپنی واپسی کے ایسے ایسے جواز پیش کیے کہ امی جان کو ماننا ہی پڑا اور پھر وہ رخصت ہو گئیں۔

جاتے ہوئے ظفر کی نظریں جب سیما کی نظروں سے ٹکرائی تو اسے وہاں ان گنت چراغ روشن نظر آئے جن کی روشنی اسے بہت کچھ سمجھا گئی اور سیما مطمئن ہو گئی۔ ظفر کی الوداعی نظریں اس کا حوصلہ بڑھا گئی تھیں۔ ان کے جانے پر وہ کچھ ملول اور افسردہ ضرور ہو گئی تھی لیکن جب اسے ان نظروں کا خیال آتا، اس کے دل کو جیسے حوصلہ سا مل جاتا۔

وقت گزرتا گیا۔ دن کٹتے گئے لیکن سیما کے دل سے ظفر کی تصویر دھندلا نہ

سکی۔ اسے یقین تھا کہ وہ واپس ضرور آئے گا اور پھر تقریباً پندرہ دن کے بعد وہ آ گیا۔

امی حسب معمول کسی پڑوسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ وہ گھر میں داخل ہوا تو سیما کھل اٹھی لیکن ظفر اسے کافی پریشان دکھائی دیا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کر سیدھا کمرے میں لے گیا اور پھر بولا۔

''میں زیادہ دیر نہیں رک سکتا۔ میری بات توجہ سے سنو......! اور ہاں......! خالہ جان کو میری آمد کے متعلق کچھ نہ بتانا۔''

اس نے چند لمحے پریشانی کے انداز میں ادھر ادھر دیکھا اور سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

''امی جان سخت غصے میں ہیں اور کسی صورت میری بات ماننے کو تیار نہیں ہو رہیں۔ ہاں......! اگر خالہ جان خود ان سے ہمارے رشتے کی بات کریں تو مجھے پورا یقین ہے وہ مان جائیں گی۔'' ظفر کی بات سن کر سیما بری طرح گڑبڑا گئی اور پھر گھبرائے ہوئے انداز میں بولی۔

''پاگل ہو گئے ہو ظفر......! میں بھلا امی جان سے کیسے بات......''

''نہیں......! تم غلط سمجھی ہو......! تمہیں خالہ جان سے بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں...... میں سارا پروگرام بنا کر یہاں پہنچا ہوں۔ اس گاؤں میں میرے دوست الیاس نے تمام بندوست کیا ہے۔ تھوڑی مشکل ضرور پیش آئے گی لیکن مجھے یقین ہے کہ بات بن جائے گی۔ میں صبح سے گاؤں پہنچا ہوا ہوں۔ ابھی الیاس ہی نے بتایا تھا کہ خالہ جان کسی کے گھر گئی ہیں تو میں موقع غنیمت جان کر یہاں پہنچ گیا تاکہ ساری بات تمہیں اچھی طرح سمجھا دوں۔''

ظفر نے سیما کی بات کاٹتے ہوئے طویل تقریر کر دی تو سیما کی ہکلاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

''لل...... لیکن ظفر......! کرنا کیا ہے......؟ مجھے تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔''

''اچھا.... ! میں تمہیں تفصیل سے سمجھاتا ہوں۔'' ظفر نے تسلی آمیز انداز میں ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''ادھر بیٹھو...... ! اور پوری توجہ سے میری بات سنو...... !''

جب سیما اس کے برابر بیٹھ گئی تو ظفر پوری تفصیل کے ساتھ اسے اپنا منصوبہ سمجھانے لگا۔ اس دوران سیما بار بار گھبرا کر کچھ نہ کچھ بول پڑتی۔ کوئی نہ کوئی سوال کر اٹھتی لیکن ظفر پورے یقین اور اعتماد کے ساتھ اس کے ہر سوال کا جواب دیتا رہا اور اسے قائل کرتا رہا۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب ظفر وہاں سے رخصت ہوا تو سیما اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو چکی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں اگر بتیاں سلگ رہی تھیں اور ان کی خوشبو پورے کمرے میں چکراتی پھر رہی تھی۔ فرش پر ایک بڑی دری بچھی ہوئی تھی جس نے پورے کمرے کے فرش کو بخوبی ڈھک رکھا تھا۔ بیرونی دروازے کے بالکل سامنے کمرے کا اندرونی دروازہ بھی تھا جو شاید پیچھے موجود صحن یا کسی اور کمرے میں کھلتا ہوگا لیکن اس وقت وہ دروازہ بند تھا۔ بیرونی اور اندرونی دروازے کے درمیان پورے کمرے میں دری بچھی ہوئی تھی جس پر اس وقت مختلف قسم کے لوگ بیٹھے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

پھر اندرونی دروازہ کھلا اور دو ملنگ نما آدمی نمودار ہوئے جنہوں نے بالکل دروازے کے سامنے ہی ایک خوب صورت اونی گدا بچھا دیا اور پھر اس پر ایک خوب صورت گاؤ تکیہ سجا دیا۔ ایک ملنگ نما آدمی تیزی سے ایک طرف بڑھا جہاں شیشے کا ایک گلاس رکھا ہوا تھا۔ جس میں شاید آٹا بھرا ہوا تھا اور اس آٹے کے اندر گڑی اگر بتیاں کمرے میں خوشبوئیں پھیلانے کا موجب تھیں۔ اس ملنگ نما آدمی نے وہ گلاس اٹھایا اور گدے کے سامنے سجا دیا۔ پھر ایک طرف مؤدب کھڑا ہوگیا جبکہ دوسرا آدمی دوبارہ اندرونی کمرے میں غائب ہوگیا۔

چند لمحوں بعد دروازہ دوبارہ کھلا لیکن اس مرتبہ جو شخصیت کمرے میں سے

برآمد ہوئی، اسے دیکھ کر وہاں سب لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے۔ لمبے قد کا مالک وہ آدمی گدے پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے سب لوگوں کو نیچے بیٹھنے کے لئے کہا۔ تمام لوگ دوبارہ سے بیٹھ گئے۔ ٹھیک اسی لمحے اندرونی دروازے سے اندر جانے والا ملنگ نما آدمی باہر نکلا۔ اس کے ہاتھوں میں ایک بہت بڑا پنکھا تھا جو لکڑی کے ایک ڈنڈے یا شاید بانس کے ساتھ جڑا ہوا تھا۔ یہ پنکھا شاید کھجور کے پتوں سے بنایا گیا تھا لیکن اس پر خوب صورت مخملیں کپڑا چڑھا ہوا تھا اور وہی کپڑا اس کے ساتھ جڑے ڈنڈے یا بانس پر بھی چڑھایا گیا تھا۔

ملنگ نما آدمی ایک سائیڈ پر کھڑا ہو کر گدے پر بیٹھے مضبوط جسم کے مالک اس آدمی کو پنکھا جھلنے لگا جس کی لمبی لمبی زلفیں تھیں، بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ انگارہ آنکھیں تھیں۔ اس نے ایک نظر کمرے میں بیٹھے تمام لوگوں پر دوڑائی اور پھر ایک کونے میں بیٹھی بوڑھی عورت سے مخاطب ہوا۔

''ہدایت بی بی......! اللہ تجھے ہدایت دے......تو پھر آ گئی......؟ تجھے کہا تو تھا کہ تعویذ کسی اونچے درخت سے بندھوا دے...... تیرا بیٹا واپس آجائے گا...... کچھ دن صبر تو کر...... مگر تو روز آجاتی ہے...... جا...... چالیس دن انتظار کر...... آجائے گا تیرا بیٹا...... چل اٹھ...... اب جا یہاں سے۔''

وہ عورت ہاتھ باندھ کر الٹے قدموں دروازے کی طرف جاتے ہوئے بولی۔

''پیر بابا......! میرا ایک ہی بیٹا تھا، خوب صورت، گھبرو جوان، تین مہینے سے اس کا پتا نہیں چل رہا۔ آپ تو اللہ والے ہو جی......! بس آپ کی دعائیں لینے آجاتی ہوں جی......! معاف کر دیں......!'' اس کی آنکھوں میں آنسو اور لہجے میں لجاجت تھی۔ پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ ٹھیک اسی لمحے الیاس اور ظفر کمرے میں داخل ہوئے اور پیر بابا کو سلام کر کے ایک کونے میں بیٹھ گئے۔

پیر بابا نے غور سے ان کی جانب دیکھا اور پھر اس شخص کی طرف متوجہ ہوگیا جو ہاتھ باندھے اس کے سامنے آیا تھا اور پھر دو زانو بیٹھ کر اپنا مسئلہ بیان کرنے لگا۔

پیر بابا نے پوری توجہ سے اس کی بات سنی اور پھر ملنگ کو اشارہ کیا۔ اس نے جھٹ سے کاغذ اور قلم نکال کر پیر بابا کے سامنے رکھ دیا۔ پیر بابا نے منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے کاغذ پر کچھ تحریر فرمایا اور پھر وہ کاغذ اس شخص کے حوالے کر دیا۔

اس آدمی نے کاغذ کو ادب سے چوما اور پھر اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا اور پیر بابا کے سامنے رکھ کر الٹے قدموں چلتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

پھر ایک ایک کر کے سب لوگ باری باری پیر بابا کے سامنے آتے گئے۔ وہ سب اپنے مسائل بیان کرتے۔ ان کے حل کے لئے کاغذ کا ٹکڑا حاصل کرتے اور کاغذ کے کچھ ٹکڑے پیر بابا کے سامنے ڈال کر باہر نکل جاتے۔ کاغذ کے ٹکڑوں کا یہ تبادلہ تقریباً تین سے چار گھنٹوں تک جاری رہا۔ اس دوران کئی بار پیر بابا کی نظریں الیاس اور ظفر کی جانب اٹھیں۔ لیکن وہ خاموش اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔

پیر بابا کی جہاندیدہ نگاہیں ان کے چہرے کے تاثرات سے ان کے دل کا حال جان چکی تھیں۔ دن رات یہی تو کام تھا ان کا اور پھر جب کمرے میں موجود آخری شخص بھی باہر نکل گیا تو الیاس نے ظفر کو ٹہوکا دیا۔ وہ ہچکچاتا ہوا سا اٹھا اور پیر بابا کے سامنے جا بیٹھا۔ ابھی وہ مناسب الفاظ کی تلاش میں ہی تھا کہ پیر بابا کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

''عشق کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ بچہ میرے پاس کیوں آ گئے......؟ یہاں اس قسم کے کام نہیں کئے جاتے۔''

اور پیر بابا کی یہ بات سن کر ظفر بوکھلا کر رہ گیا۔ ابھی تو وہ حرف مدعا زبان پر بھی نہ لایا تھا اور پیر بابا بات کی تہہ تک پہنچ گئے تھے۔ بڑے پہنچے ہوئے بزرگ تھے۔ ظفر فوراً ہی ایمان لے آیا۔ اس کے ہاتھ آپوں آپ ہی جڑ گئے اور پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز جذبات کی شدت کپکپا رہی تھی۔

''لیکن پیر بابا......! میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اس سے محبت

کرتا ہوں۔ وہ اتنی پیاری، اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔ آپ...... آپ کوئی راستہ تو نکالیں......!''

''واہ بھئی واہ......! تو تو پکا عاشق ہے بھئی......! تیرے لئے تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔'' پیر بابا کو راضی ہوتا دیکھ کر ظفر کی جان میں جان آئی۔

''اچھا......! یہ بتا کیا لڑکی بھی تجھ سے محبت کرتی ہے......؟'' پیر بابا نے سوال کیا۔

''جی پیر بابا......! وہ بھی مجھ سے محبت کرتی ہے لیکن گھر والے راضی نہیں ہو رہے۔ سگی خالہ کی بیٹی ہے میری لیکن میری ماں ہی اس رشتے کی مخالف ہے۔'' ظفر نے افسردگی سے جواب دیا تو پیر بابا نے ایک اور سوال کیا۔

''اچھا......! اگر لڑکی والے خود تیری ماں سے بات کریں تو کیا وہ مان جائے گی......؟'' ظفر کو امید کی ایک کرن نظر آئی۔ وہ بولا۔

''جی پیر بابا......! ایسا ہو جائے تو یقیناً وہ مان جائیں گی۔''

''اچھا......! تو پھر سن......! یہ کام تعویذوں سے ہونے والا نہیں ہے لیکن تیرے پیار کی سچائی دیکھتے ہوئے میں تیری مدد بھی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ بتا اگر تو لڑکی سے کوئی بات کہے تو وہ مان لے گی......؟'' پیر بابا نے ایک اور سوال کیا۔

''جی پیر بابا......! میرا خیال ہے کہ وہ مان لے گی۔'' ظفر نے جواب دیا۔

''اچھا تو پھر کان لگا کر سن......! اور اس پر عمل کر......!'' پھر پیر بابا اسے تفصیل سے سمجھانے لگے کہ اس سلسلے میں اسے کیا کرنا ہوگا؟ پیر بابا کی ساری بات سننے کے بعد ظفر نے سوال کیا۔

''لیکن پیر بابا......! اس کا فائدہ کیا ہوگا......؟''

''بے وقوف......! اس پورے علاقے میں اور کوئی صاحب علم نہیں ہے۔ اسے علاج کے لئے میرے ہی پاس لایا جائے گا تب میں اس کی ماں سے کہوں گا کہ خیریت اسی میں ہے کہ اپنی لڑکی کی شادی اپنی بہن کے گھر کر دے ورنہ پچھتائے

گی اور یوں تیرا کام بن جائے گا۔''

پیر بابا کی بات پوری طرح ظفر کی سمجھ میں آئی تو اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔ اسے پورا یقین ہوگیا کہ اب سیما اس کی ہو کر رہے گی۔ اس نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر پیر بابا کے سامنے رکھے اور پھر بڑی عقیدت مندی سے الٹے قدموں چلتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔

الیاس نے بھی اس کی تقلید کی تھی جبکہ پیر بابا چند لمحے پرُخیال انداز میں دروازے کی طرف تکتے رہنے کے بعد سامنے موجود نوٹوں کے ڈھیر کو سمیٹنے لگے۔ ان کے ذہن میں ظفر کے الفاظ گونج رہے تھے۔

''وہ اتنی پیاری...... اتنی خوب صورت ہے کہ میں اس کے لئے کچھ بھی کر سکتا ہوں۔''

☆☆☆

سیما کی حالت خراب تھی۔ اس نے اپنے کپڑے تار تار کر لئے تھے اور بری طرح چیختے چلاتے ہوئے پورے گھر میں بھاگی پھر رہی تھی۔

اس کی چیخیں سن کر محلے کی دو تین عورتیں بھی آ پہنچی تھیں لیکن کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر کریں تو کیا کریں......؟ ادھر سیما اپنے بال نوچ رہی تھی اور اول فول گفتگو کئے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی تھیں۔ بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔ کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ چکے تھے اور دوپٹے کا تو اسے ہوش ہی نہیں تھا۔

اس کی ماں نے دبوچ کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن اس نے اس بری طرح جھٹکا دے کر خود کو چھڑایا تھا کہ اس کی ماں انگشت بدنداں رہ گئی۔

سیما کے بدن میں تو جیسے کوئی شیطان حلول کر گیا تھا۔ ایک وحشیانہ اور جنونی سا انداز تھا اس کا، سیما کی ماں پریشان انداز میں کھڑی فریادی نظروں سے ان خواتین کا چہرہ تکے جا رہی تھی جو سیما کی چیخ و پکار سن کر اکٹھی ہوگئی تھیں لیکن کسی کی

جرأت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ سیما کو پکڑنے کی کوشش کرتیں یا اس کے قریب جاتیں۔

پھر سیما بھاگتے بھاگتے ایک چارپائی سے ٹکرائی اور الٹ کر چارپائی پر جا گری۔ اب اس کے جسم کو تشنج زدہ انداز میں جھٹکے سے لگ رہے تھے۔ یہ دیکھ کر سیما کی ماں سے رہا نہ گیا۔ وہ تڑپ کر بیٹی کے قریب پہنچی اور سہارا دے کر اسے بٹھانے کی کوشش کی۔ ایک عورت نے بھاگ کر گھڑونچی سے پانی کا گلاس بھرا اور گلاس لئے ماں بیٹی کے قریب پہنچی۔ ٹھیک اسی لمحے سیما نے اپنی ماں کے ہاتھ ایک مرتبہ پھر بری طرح جھٹک دیئے اور انتہائی بدتمیزی سے بولی۔

''اے بڑھیا...... ! پیچھے ہٹ...... ! اپنا ناپاک ہاتھ ہم سے دُور رکھ۔ جانتی نہیں کہ ہم آئے ہوئے ہیں۔'' وہ سیما کی آواز ہی نہ تھی، ایک عجیب سی نامانوس مردانہ سی آواز تھی جسے سن کر پانی لانے والی عورت کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر جا پڑا اور وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔

سیما کی والدہ بھی ایک مرتبہ پھر پیچھے ہٹ چکی تھیں۔ اب سیما بال جھلاتے اور اپنا سر گھماتے ہوئے بری طرح جھول رہی تھی جبکہ اس کی ماں کا دل لرز رہا تھا۔ جھومتے جھومتے سیما پٹ سے گری اور پھر ساکت ہوگئی۔ اس کی ماں نے بھاگ کر اس کے ہاتھ پاؤں سیدھے کئے اور اسے چارپائی پر چت لٹا دیا۔ سیما کے منہ سے جھاگ نکل رہے تھے اور وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''ہائے ہائے کبریٰ بہن...... ! سیما پر تو جن آ گیا ہے۔ اللہ معاف کرے...... کیسی مردانہ آواز میں باتیں کر رہی تھی اور حال تو دیکھو...... اپنا ہوش ہی نہیں تھا بے چاری کو......'' ایک دیہاتی عورت نے سیما کی ماں کبریٰ کو مخاطب کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تو کبریٰ اس کی طرف دیکھ کر رہ گئی۔ ایک ہی تو بیٹی تھی اس کی اور اس کا یہ حال تھا کہ کبریٰ کا دل دہل رہا تھا۔

''وہ اپنی رحمتے کی شانو پر بھی تو جن آ گیا تھا...... بالکل یہی حال تھا اس کا بھی۔ ایک دن دورے کی حالت میں گھر سے نکل بھاگی تھی اور پھر بڑی نہر میں جا

کودی تھی۔ پورے چار دن بعد لاش ملی تھی بے چاری کی۔'' ایک دوسری عورت نے کبریٰ کی معلومات میں اضافہ کیا اور کبریٰ کو مزید دہلا دیا۔

''ہاں ہاں ہاجرہ......! جب جن آتا ہے تو بندہ اپنے ہوش میں تھوڑی ہوتا ہے۔ اس شانو بے چاری کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ وہ نہر میں کود رہی ہے۔ پتا نہیں کیسے جان نکلی ہوگی بے چاری کی اور وہ مہران کی لڑکی گڈی پر بھی تو جن آ گیا تھا۔ وہ تو بھلا ہو پیر بابا کا...... ایسا علم کیا کہ گڈی بالکل ٹھیک ہوگئی پھر کبھی جن نہیں آیا اس پر۔ اب تو خیر سے تین کاکے ہیں اس کے۔''

پہلی عورت نے تائید کرتے ہوئے کہا تو کبریٰ مزید پریشان ہوگئی۔ لیکن ان کی باتوں میں اسے ایک کام کی بات بھی سنائی دے گئی تھی۔ ایسی عورتیں ہر جگہ پائی جاتی ہیں جو جاتی تو اگلے کا غم بانٹنے ہیں لیکن اس کے دکھوں میں مزید اضافہ کر کے چلتی بنتی ہیں۔

جب بولتی ہیں تو یہ بھی نہیں سوچتیں کہ ان کی باتیں دوسروں کے لئے کتنی عذاب ناک ہیں۔ انہیں تو صرف بولنا ہوتا ہے اپنے لفظوں کا ذخیرہ ختم کرنا ہوتا ہے اور وہ ایسا کر کے رہتی ہیں ورنہ ان کے پیٹ کا ابال کیسے ختم ہو......؟ یہ خواتین بھی اسی قبیل کی تھیں لیکن جہاں ان کی باتیں کبریٰ کے لئے اذیت کا باعث بن رہی تھیں وہیں اسے ایک نیا راستہ بھی دکھا گئی تھیں۔

اس نے بھی پیر بابا کے متعلق بہت کچھ سن رکھا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ پیر بابا بہت ''کرنی والے'' ہیں۔ خواتین جہاں بھی اکٹھی ہو کر بیٹھ جائیں وہاں سارے گاؤں کے قصے دوہرائے جاتے ہیں اور پیر بابا کے قصے بھی اس نے اکثر سنے تھے۔

وہ دل ہی دل میں پیر بابا سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ ٹھیک اسی لمحے سیما نے کراہ کر آنکھیں کھولی تو کبریٰ جلدی سے اس کی جانب متوجہ ہوگئی۔ سیما چارپائی پر بیٹھی حیرت سے پلکیں جھپکا رہی تھی۔ اس نے اردگرد نظریں دوڑا کر محلے کی عورتوں کی طرف دیکھا اور پھر معصومیت بھرے لہجے میں اپنی ماں سے سوال کیا۔

''کیا بات ہے امی جان......! خیریت تو ہے......؟ یہ سب لوگ کیوں جمع ہیں یہاں پر......؟ اور...... اور یہ میرے کپڑوں کو کیا ہوا......؟'' سیما کی نظر جب بات کرتے کرتے اچانک اپنے تار تار کپڑوں پر پڑی تو وہ حیرت سے چلائی۔

کبریٰ نے ایک طویل سانس لی اور پھر محبت بھرے انداز میں سیما کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

''کچھ نہیں بیٹا......! شاید چکر آ گیا تھا تمہیں......!'' محلے دار خواتین نے جب حالات معمول پر دیکھے تو ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگیں۔ بالکل یوں جیسے سینما کا شو ختم ہونے پر تماشائی باہر نکلتے ہیں۔ باقی کا دن خیریت سے گزر گیا اور سیما پر دوبارہ جن بھی نہیں آیا۔ لیکن کبریٰ پریشان تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جن اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑتے اور سیما کسی بھی وقت دوبارہ زیر اثر آ سکتی ہے اور کبریٰ یہ رسک ہرگز نہیں لینا چاہتی تھی ویسے بھی وہ محلے دار عورتوں کی باتیں سن سن کر سخت خوفزدہ تھی اور کیوں نہ ہوتی......؟

سیما اس کی اکلوتی اولاد تھی اور وہ اس کی جان داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی۔ اسے ہر صورت اس جن سے نجات حاصل کرنا تھی جو اس کی بیٹی کے ہوش و حواس چھین لیتا تھا اور کسی بھی وقت اسے کوئی بھی نقصان پہنچا سکتا تھا۔

شام ہوتے ہی کبریٰ نے سیما کو ساتھ لیا اور گھر سے باہر نکل کر گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر روانہ ہوگئی۔ اسے پیر بابا کا ڈیرہ معلوم تھا اور وہ یہ بھی جانتی تھی کہ یہ وقت پیر بابا کی ملاقات کا وقت نہیں ہے کیونکہ پیر بابا مغرب کی اذان سے پہلے پہلے تمام سائلین کو فارغ کر دیتے تھے اور پھر کسی سے نہیں ملتے تھے۔ لیکن کبریٰ دن کے وقت سب لوگوں کے سامنے ملنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ آخر جوان بیٹی کا معاملہ تھا، اسے یقین تھا کہ پیر بابا اس کی مجبوری کو سمجھ جائیں گے اور ملاقات کے لئے ضرور وقت دیں گے۔

شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے اور سارا دن تلاش رزق میں مصروف

رہنے والے پرندے بھی اپنے اپنے گھونسلوں میں واپس لوٹ چکے تھے۔ ادھر سورج نے افق کی گود میں آخری ہچکی لی ادھر کبریٰ، سیما کو ساتھ لئے پیر بابا کی چوکھٹ پر پہنچ گئی۔

پیر بابا کا ڈیرہ گاؤں سے کافی فاصلے پر قطار اندر قطار لگے درختوں کے درمیان میں واقع تھا۔ قریب ہی کچھ فاصلے پر صاف و شفاف پانی کی ایک چھوٹی سی نہر بھی بہتی تھی جس کا پانی انتہائی ٹھنڈا اور فرحت بخش تھا۔ یہاں آنے والے اکثر لوگوں کا عقیدہ تھا کہ پیر بابا کے زیرِ سایہ بہنے والی اس ندی کا پانی بہت سی بیماریوں سے شفایابی بخشتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ گرمیوں کے دنوں میں آنے والے اکثر سوالی اس نہر کے پانی میں ضرور نہاتے تھے۔

کبریٰ نے ڈیرے کے دروازے پر دستک دی لیکن جواب میں خاموشی چھائی رہی۔ چند لمحے انتظار کے بعد کبریٰ نے دوبارہ دستک دی لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ کبریٰ پریشان ہو کر سوچنے لگی کہ شاید پیر بابا اپنے کسی مرید کے ہاں چلے گئے ہوں......؟ لیکن اس طرح تو اس کا طویل فاصلہ طے کر کے آنا ایک طرح سے بے کار ہی جاتا اور پھر سب سے بڑی پریشانی تو اسے سیما کی طرف سے تھی اگر سیما کو دوبارہ دورہ پڑ گیا تو کیا ہوگا......؟ اور اگر جن کو معلوم ہو جائے کہ وہ یہاں کس ارادے سے لائی ہے سیما کو تو کیا ہوگا......؟

آن کی آن میں کتنے ہی خدشات کا شکار ہو کر کبری نے آخری کوشش کے طور پر تیسری مرتبہ ایک زوردار دستک دی۔ نتیجہ امید افزا تھا۔ اندر سے کسی کے قدموں کی آواز بلند ہوئی جو رفتہ رفتہ دروازے تک پہنچ کر رک گئی۔ پھر دروازہ کھلا اور لمبا چوڑا ایک شخص نمودار ہوا جس کے سر پر لمبی زلفیں تھیں، بڑی بڑی مونچھیں، سرخ انگارہ آنکھیں اور ہاتھ میں تیزی سے گردش کرتی ہوئی تسبیح تھی اور یہ شخص ''پیر بابا'' کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔

اپنے دروازے پر دو خواتین کو دیکھ کر اس کی پاٹ دار آواز بلند ہوئی۔

''کون ہو بی بی.....! تم لوگ.....؟ جانتی نہیں کہ یہ وقت ہماری عبادت کا ہے.....؟ شام کے وقت ہم کسی سے نہیں ملتے کیونکہ اس وقت سے لے کر اگلی صبح تک ہم اپنے وظائف کرتے ہیں۔'' پیر بابا کا سخت لہجہ سن کر کبریٰ لجاجت سے بولی۔

''میں جانتی ہوں پیر بابا.....! لیکن جوان بیٹی کا معاملہ ہے۔ تماشا نہیں بننا چاہتی اس لئے بے وقت آنے کی معافی چاہتی ہوں۔ آپ تو اللہ کے نیک بندے ہیں۔ آپ سے تو کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے۔ ہماری مدد فرمائیں پیر بابا.....!''

اور پیر بابا نے کبریٰ کی بات سن کر پہلی مرتبہ پوری توجہ سے سیما کی جانب دیکھا جو سیاہ چادر میں نقاب کئے ہوئے ایک جانب خاموش کھڑی تھی۔ پیر بابا کی نظریں کسی عقاب کی مانند اس کا مکمل جائزہ لے رہی تھیں اور لمحوں میں چادر کے اندر چھپے وجود کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچ چکی تھیں کہ یہ دلکش لڑکی کون ہو سکتی ہے.....؟ پیر بابا کی نظروں کو محسوس کر کے سیما اپنی جگہ پر کسمسا کر رہ گئی۔ اسے ان نگاہوں کی تپش اپنے وجود میں سوراخ کرتی ہوئی محسوس ہوئی تھی لیکن جلد ہی پیر بابا نے نظریں ہٹا لیں اور پھر راستہ چھوڑتے ہوئے کہا۔

''آؤ..... اندر آ جاؤ.....!''

کمرے میں اگربتیوں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ شاید اگربتیوں کی یہ خوشبو اس کمرے میں ہی رچ بس گئی تھی اور اس ماحول کا ایک حصہ معلوم ہوتی تھی۔ سارا دن سلگنے والی اگربتیاں شاید کچھ ہی دیر پہلے وہاں سے ہٹائی گئی تھیں لیکن ان کی خوشبو اب بھی موجود تھی۔ پیر بابا اپنی مخصوص نشست اونی گدے پر براجمان ہو گئے۔ تسبیح مسلسل گردش میں تھی۔

پھر پیر بابا کی آواز بلند ہوئی۔

''بڑا ظالم اور خطرناک جن ہے۔ اتنی آسانی سے جان نہیں چھوڑے گا۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم یہاں آ گئیں ورنہ اگلی مرتبہ بچی کی جان بھی جا سکتی تھی۔'' یہ سن کر کبریٰ

پیر بابا کے سامنے سجدہ ریز ہوگئی۔ وہ ان کی کرامت اور علم پر ایمان لے آئی تھی۔ یہ بات اس کے لئے انتہائی حیرانی کا باعث تھی کہ اس نے تو ابھی کچھ بتایا ہی نہیں اور پیر بابا کو سب معلوم ہے۔ یہ کرامت نہیں تو اور کیا ہے......؟ واقعی پیر بابا جیسے لوگوں سے کچھ بھی چھپا ہوا نہیں ہوتا۔

پھر وہ بولی تو اس کی آواز میں عقیدت ہی عقیدت لہریں لے رہی تھی۔

''پیر بابا......! آپ تو دلوں کے بھید جانتے ہیں۔ اللہ کا خاص کرم ہے آپ پر...... میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ میرا ہے ہی کون......؟ اسے اس ظالم جن سے نجات دلا دیں۔ ساری زندگی دعائیں دوں گی۔ اللہ آپ کا اقبال بلند کرے۔ آپ کے علم میں ترقی دے۔ پیر بابا......! میری بچی کو بچالیں۔''

کبریٰ کی آواز بھرا گئی اور سیما اپنی ماں کی محبت کا یہ اظہار دیکھ کر لرز کر رہ گئی۔ وہ تو جانتی تھی کہ اصل حقیقت کیا ہے اور پھر پیر بابا......! وہ تو خود اسے کسی جن سے کم نہیں لگا تھا۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی......؟ اس کے پاس دوسرا راستہ بھی تو نہیں تھا۔ وہ ظفر کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اگر وہ ظفر کے کہنے پر یہ سب نہ کرتی تو شاید وہ ظفر کو کبھی حاصل نہ کر سکتی۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ سے معافی مانگی اور تہیہ کر لیا کہ وہ آئندہ زندگی میں کبھی اپنی ماں کے لئے پریشانی کا باعث نہیں بنے گی۔

کبریٰ کی بات ختم ہوئی تو پیر بابا کی آواز بلند ہوئی۔

''لڑکی......! تو ادھر اندر حجرے میں چلی جا......! مجھے تیری ماں سے کچھ باتیں کرنی ہیں...... جا...... اندر چلی جا......!'' سیما نے اندرونی دروازے کی طرف دیکھا پھر ہچکچا کر اپنی ماں کی طرف دیکھا تو کبریٰ بولی۔

''ہاں ہاں...... بیٹا......! تو اندر چلی جا......! بے فکر ہو جا...... یہاں سے کوئی خالی ہاتھ نہیں جاتا۔'' اور سیما اٹھ کر دل ہی دل میں یہ کہتی ہوئی کہ (اللہ آپ کی زبان مبارک کرے امی جان......!) اندرونی کمرے میں داخل ہوگئی۔

وہ جانتی تھی کہ اب پیر بابا امی جان سے یہی کہیں گے کہ اگر بیٹی کی زندگی بچانی ہے تو اس کا رشتہ اپنی بہن کے گھر کر دے اور پھر خوشیاں ہی خوشیاں اس کا مقدر ٹھہریں گی۔ ظاہر ہے اس کے رشتے کی بات اب پیر بابا اس کے سامنے تو نہیں کر سکتے تھے نا......؟ ادھر پیر بابا کبریٰ سے مخاطب تھے۔

''دیکھو بی بی......! جن بڑا زبردست ہے۔ کوئی معمولی پیر یا عامل اگر اس سے مقابلے کی کوشش بھی کرے گا تو اپنی جان سے جائے گا۔ تم عورت ذات ہو اور اپنی بیٹی سے محبت بھی بہت کرتی ہو۔ اس لئے میں اس معاملے میں ہاتھ ڈال رہا ہوں ورنہ تو میں بھی جواب ہی دیتا۔''

اللہ آپ کو اجر دے پیر بابا......! آپ نے مجھ غریب کی خاطر اتنا سوچا۔'' کبریٰ نے تشکر آمیز نظروں سے پیر بابا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو پیر بابا بولے۔

''دیکھو بی بی......! ہمارا یہ ڈیرہ ایک مکمل پاکیزہ جگہ ہے۔ جہاں داخل ہوتے ہوئے بڑے بڑے جنوں کی روح فنا ہوتی ہے اور جس جن کو ہم اپنے علم کے زور سے یہاں بلائیں یہاں داخل ہو کر اس کی آدھی طاقتیں سلب ہو جاتی ہیں۔ پھر وہ جن ہمارا غلام بن جاتا ہے۔ تم نے اچھا کیا کہ بچی کو یہاں لے آئیں۔ ہم آج ساری رات وظیفہ کریں گے اور اس نامراد جن کو آج ہی قید کر لیں گے۔ تم بے فکر ہو کر بچی کو یہاں چھوڑ جاؤ اور کل آ کر اسے واپس لے جانا۔ اللہ نے چاہا تو زندگی میں دوبارہ کبھی اس پر جن نہیں آئے گا۔''

پیر بابا کی بات سن کر ایک لمحے کے لئے کبریٰ کے چہرے پر چند شکنیں سی نمودار ہوئیں لیکن دوسرے ہی لمحے معدوم ہو گئیں۔

''جو حکم پیر بابا......! کل کس وقت حاضر ہو جاؤں......؟'' کبریٰ نے مؤدبانہ انداز میں پوچھا تو پیر بابا بولے۔

''بس...... دن چڑھے آ جانا......!''

''ٹھیک ہے پیر بابا......! کیا میں بچی کو سمجھا دوں کہ وہ رات یہیں رکے۔''

کبریٰ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''ہاں ہاں...... ! اندر چلی جاؤ...... ! اور اسے سمجھا دو...... !''

پیر بابا سے اجازت ملنے پر کبریٰ بھی اندرونی حصے میں داخل ہوگئی جبکہ پیر بابا وہیں بیٹھے رہے۔ ان کے ہاتھ میں موجود تسبیح تیزی سے حرکت کرتی جا رہی تھی۔

جب کبریٰ سے صورت حال معلوم ہوئی اور رات وہیں رکنے کا حکم بھی تو سیما گڑبڑا کر رہ گئی۔ یہ بات تو پروگرام میں شامل ہی نہیں تھی۔ ایک لمحے کے لئے شکوک وشبہات کے ناگ اس کے دماغ میں اپنے پھن پھیلا کر رہ گئے لیکن اگلے ہی لمحے وہ مطمئن ہوگئی۔ شاید پیر بابا سارے معاملے کو حقیقت کا رنگ دینا چاہتے تھے کہ کسی قسم کے شبے کا اندیشہ نہ رہے اور پھر پیر بابا تو اتنے علم والے اور اللہ کے نیک بندے تھے، سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی ماں کی خواہش بھی یہی تھی، سو اس نے سر تسلیم خم کر دیا۔

کبریٰ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پھر اسے تسلی دیتے ہوئے رخصت ہوگئی۔ جب وہ گھر سے باہر نکلی تو عشاء کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں کی طرف جانے والا کچا راستہ دور تک سنسان تھا۔ کبریٰ گاؤں کی طرف واپس چل دی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد تاریکی کا حصہ بن گئی۔

وقت دھیرے دھیرے سرکتا رہا اور رات آگے بڑھتی رہی۔ درختوں کے جھنڈ میں گھرے پیر بابا کے ڈیرے پر گہرا سکوت طاری تھا۔ ڈیرے سے کچھ ہی فاصلے پر بہتی ندی کا پانی اپنی دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ دور کہیں کسی کھیت میں سے کسی گیدڑ کے رونے کی آواز بلند ہو رہی تھی۔ رات کے بارہ یا ساڑھے بارہ کا وقت ہوگا جب اچانک پیر بابا کے ڈیرے سے ایک دلدوز چیخ بلند ہوئی...... پھر دوسری چیخ...... لیکن دوسری چیخ درمیان میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ یوں جیسے چیخنے والے کا منہ بھینچ دیا گیا ہو...... پھر گھٹی گھٹی سی چند مزید چیخیں سنائی دیں...... یہ چیخیں سیما کے علاوہ اور کسی کی نہ تھیں۔

☆☆☆

پیر بابا کے ڈیرے سے واپس آنے کے بعد سیما کو جیسے چپ لگ گئی تھی۔ نہ وہ ہنستی، نہ مسکراتی نہ ہی پہلے کی طرح بے تکان ڈھیروں باتیں کرتی۔ وہ شوخ اور چنچل سیما شاید پیر بابا کے ڈیرے پر ہی رہ گئی تھی جو اس گھر میں دوڑتی، بھاگتی، اٹھکیلیاں کرتی پھرتی تھی۔ نہ کھانے کا ہوش نہ پہننے کا..... آٹھ آٹھ دن جن کپڑوں میں پھر رہی ہے، وہی پہنے ہوئے ہیں۔

کبریٰ نے یاد دلایا۔

''سیما.....! کتنے دن ہوگئے تو نے یہی سوٹ پہن رکھا ہے۔چل میرا بیٹا.....! نہا کر کپڑے تبدیل کر لے.....!'' تو کپڑے بدل لے۔کبریٰ نے کھانا دیا تو خاموشی سے کھا لیا۔ اگر کہیں بیٹھی ہے تو خاموش..... گم سم..... جیسے فضا میں کسی غیر مرئی شے کو تلاش کر رہی ہو۔

کبریٰ اس کی اس حالت کو سمجھ تو نہیں پا رہی تھی لیکن پریشان ضرور تھی اور جہاں پریشان تھی وہیں مطمئن بھی تھی کہ کبریٰ کو اس دن کے بعد سے دورہ نہیں پڑا تھا۔ اس پر جن نہیں آیا تھا۔ پیر بابا کے ہاں سے آئے ہوئے تقریباً تین ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا لیکن اس دوران دوبارہ کبھی بھی سیما پر وہ کیفیت طاری نہیں ہوئی تھی جو جن آنے کی نشانی تھی۔ سو کبریٰ مطمئن تھی۔

اس کا خیال تھا کہ آہستہ آہستہ سیما کی یہ حالت بھی معمول پر آجائے گی اور پھر وہ وہی سیما بن جائے گی جو وہ تھی لیکن ایسا نہیں ہو سکا تھا اور شاید ہو بھی نہیں سکتا تھا۔ سیما کے اندر بہت بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ اس دن سیما کی ماں گھر سے نکلی تو کچھ ہی دیر کے بعد ظفر آن دھمکا۔

جب سے سیما، پیر بابا کے ہاں سے واپس آئی تھی،ظفر آج تیسری مرتبہ آیا تھا۔ دو مرتبہ پہلے بھی وہ سیما سے یہ پوچھنے کی کوشش کر چکا تھا کہ پیر بابا کے کہنے کے بعد بھی سیما کی امی نے اس کی امی سے بات کیوں نہیں کی.....؟ لیکن سیما خاموشی سے اسے تکتی رہ گئی تھی۔ وہ ظفر کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دے سکی

تھی۔ جواب ہوتا تو دیتی۔

آج بھی جب ظفر نے کہا۔

''سیما......! آخر کیا ہوگیا ہے تمہیں......؟ کیا میری ضرورت نہیں رہی تمہیں......؟ یا مجھ سے محبت نہیں رہی......؟ اس خاموشی کا مطلب......؟ آخر جواب کیوں نہیں دیتی تم......؟'' تو سیما پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ اب وہ مزید چپ نہیں رہ سکتی تھی اور ویسے بھی شاید اب اس کی خاموشی کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

چند ہی دنوں کی تو بات تھی سب خود ہی جان جاتے اس کی بربادی کی کہانی۔ آخر وہ کتنی دیر تک چھپاتی۔

''ظفر......! میں تمہارے قابل نہیں رہی...... میں...... میں ماں بننے والی ہوں۔'' اس نے ہچکیوں کے درمیان کہا تو ظفر سناٹے میں رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے آسمان اچانک اس کے سر پر آن گرا ہو اور زمین اس کے پیروں کے نیچے سے سرک گئی ہو۔

''کک...... کیا کہہ رہی ہو سیما......! تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے......؟'' اور سیما کی آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں ظفر......! تمہارے اس پیر بابا نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔'' سیما نے روتے بلکتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا اور ظفر خاموش کھڑا سنتا رہ گیا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا۔ وہ یک ٹک سیما کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ پھر وہ اچانک پلٹا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔

سیما حیران تھی کہ وہ کچھ بولا کیوں نہیں......؟ اچھا، برا کچھ تو کہتا...... کوئی تو بات کرتا لیکن اس نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

''کیا سوچا ہوگا اس نے یہ سب سن کر......؟ کیا اسے پیر بابا پر غصہ آیا ہوگا......؟ یا میری مظلومیت پر رحم......؟'' سیما سوچ رہی تھی، خود سے سوال کر رہی تھی

پاکستان ورچوئل لائبریری
وقار عظیم
ڈاٹ کام

لیکن جواب دینے والا کوئی نہ تھا۔ وہ تو جا چکا تھا۔ خاموش، چپ چاپ، بغیر کسی رد عمل کا اظہار کیے۔ سیما پریشان ہوگئی۔ ایک دن، دو دن، تین دن اور پھر پورے پندرہ دن گزر گئے لیکن ظفر واپس نہیں آیا تو ایک دن سیما نے ماں سے کہا۔

''امی جان......! مجھے شہر جانا ہے۔ خالہ صغریٰ کے گھر مجھے لے چلو ایک بار وہاں......'' تین ساڑھے تین مہینوں میں یہ پہلی خواہش، پہلی فرمائش تھی جو سیما نے اپنی ماں سے کی تھی۔ پھر وہ منع کیسے کرتی......؟

اگلے ہی دن وہ شہر پہنچے اور پھر صغریٰ خالہ کے گھر...... اس وقت ظفر گھر پر موجود نہیں تھا۔ خالہ جان نے بظاہر محبت سے ان کا استقبال کیا لیکن ان کی جلتی ہوئی نظریں جب جب سیما کی نظروں سے ٹکراتیں، سیما کو ان آنکھوں میں ایک عجیب سا تاثر ملتا۔

شام سے کچھ پہلے ہی ظفر واپس گھر آ گیا لیکن ان پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سلام کیا اور آگے بڑھ گیا۔ سیما سے اس نے نظریں نہیں ملائی تھیں۔ سیما مسلسل موقع کی تلاش میں رہی کہ ظفر سے بات کر سکے اور یہ موقع اسے اگلے دن دوپہر کو میسر آیا جب خالہ جان اور امی جان اندر کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ اس نے باہر نکلتے ہوئے ظفر کو بیرونی دروازے پر جا لیا۔

''ظفر......! تم کچھ بھی کہے، کچھ بھی بولے بغیر وہاں سے چلے آئے اور پھر پلٹ کر نہیں آئے۔ جو کچھ بھی ہوا اس میں میرا قصور تو بتاؤ......! میں نے تمہارے کہنے پر زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ کیا، جھوٹ بولا، ڈرامہ کیا، اپنی ماں کو دھوکہ دیا۔ اس سے بدتمیزی کی۔ لیکن مجھے ملا کیا......؟ بربادی، ذلت اور رسوائی......؟ کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے......؟ اور تم...... تم نے سب کچھ جان کر بھی کوئی جواب نہیں دیا...... پلٹ کر واپس ہی نہیں آئے...... کیا یہی تمہاری محبت تھی......؟''

سیما نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا لیکن جب ظفر نے جواب دیا تو اس کا لہجہ بڑا پرسکون اور بااعتماد تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''دیکھو سیما......! میں نے جس سیما سے محبت کی تھی وہ معصوم اور پاکیزہ تھی۔ اس سیما میں اور آج کی سیما میں زمین آسمان کا فرق ہے یا یہ فرق اس وقت بھی تھا...... مجھے نظر نہیں آ سکا۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے میری آنکھوں پر بندھی پٹی خود ہی کھول دی۔ شاید قدرت کو میری بہتری منظور تھی۔ جو لڑکی ایک ناجائز بچہ اٹھائے پھر رہی ہو اور پیر بابا جیسے اللہ کے نیک بندے پر بھی الزام لگانے سے نہ چوکے، وہ کبھی بھی معصوم اور پاکیزہ نہیں ہو سکتی اور تم پہلے بھی نیک اور پاکیزہ نہیں تھیں۔ پتا نہیں گاؤں میں کس کس سے تمہارا کیا کیا رشتہ ہوگا...... جب اور کچھ نہ بن پڑا تو پیر بابا پر ہی الزام لگا دیا لیکن اس فرشتہ صفت، نیک اور عبادت گزار بندے پر الزام دھرو گی تو اس پر یقین کون کرے گا......؟ اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ اس گندگی اور غلاظت کو میں اپنا نام دوں گا یا اس کو قبول کرتے ہوئے تم سے شادی کرلوں گا تو یہ تمہاری بھول ہے۔''

ظفر نے بات ختم کی اور دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ سیما اپنی جگہ بھونچکی کھڑی تھی۔ اس کے دماغ میں دھماکے ہو رہے تھے۔ ظفر کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر کسی خنجر کی طرح چرکے لگا گیا تھا۔ اس کا پورا وجود اس وقت آندھیوں کی زد میں تھا۔ ایک طوفان ایک بھونچال تھا جو اس کو ملیا میٹ کر گیا تھا۔

کوئی بھونچال دل سے گزرا ہے
بستیاں پھر مکان کھو بیٹھیں

پھر وہ وہاں نہیں رکی تھی۔ خالہ جان کہتی ہی رہ گئیں لیکن وہ وہاں سے واپس نکل پڑے اور رات ہونے سے پہلے پہلے گاؤں واپس پہنچ گئے۔

☆☆☆

شام کا وقت تھا اور کبریٰ کے گھر میں اودھم مچا ہوا تھا۔ سیما کے کپڑے تار تار تھے۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پورے گھر میں بھاگی پھر رہی تھی اور حلق سے عجیب وغریب آوازیں نکل رہی تھیں جو خاصی حد تک مردانہ آواز سے مشابہہ تھیں۔

کبریٰ حیران پریشان دیوار سے لگی کھڑی یہ منظر دیکھ رہی تھی۔وہ سوچ رہی تھی کہ پیر بابا نے تو کہا تھا کہ اب کبھی اس پر جن نہیں آئے گا لیکن جن نہ صرف آیا ہوا تھا بلکہ آج تو سیما کے دورے میں بھی پہلے کی نسبت زیادہ شدت تھی۔

کافی دیر تک سیما کی یہ دھما چوکڑی جاری رہی پھر وہ بھاگتے بھاگتے دیوار سے ٹکرائی اور دھڑام سے زمین پر آ رہی۔وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔کبریٰ نے جلدی سے آگے بڑھ کر سیما کو پکڑا اور پھر بمشکل اسے گھسیٹ کر چارپائی تک لائی اور پھر اسے چارپائی پر لٹانے میں بھی کامیاب ہوگئی۔

کافی دیر کے بعد سیما کو ہوش آیا تو اس کا رویہ کبریٰ کے اندازے کے عین مطابق نارمل تھا۔اسے کچھ بھی یاد نہیں تھا کہ اب سے چند لمحے قبل وہ کیا کرتی رہی ہے۔

کبریٰ شدید پریشان تھی۔اس نے سیما کو کپڑے بدلنے کا کہا اور ساتھ ہی یہ بھی کہ وہ ابھی گھر سے نکلیں گے۔کہیں کام سے جانا ہے۔سیما کو معلوم تھا کہ کیا کام ہے اور کہاں جانا ہے۔

لہٰذا وہ نہانے کے بعد جلدی جلدی تیار ہوئی۔اس نے لباس چینج کیا تو ایک عدد تیز دھار اور لمبی چھری اس کے لباس میں منتقل ہو چکی تھی۔پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ گاؤں سے باہر جانے والے اس راستے پر گامزن تھیں جو لہراتا بل کھاتا بالآخر پیر بابا کے ڈیرے پر پہنچا تھا۔

خدا خدا کر کے ان کا یہ سفر اختتام پذیر ہوا۔اب وہ پیر بابا کے دروازے پر تھیں۔کبریٰ نے دستک تو حسب معمول ہی یعنی تین مرتبہ دی لیکن اس مرتبہ دروازہ کھولنے والی شخصیت پیر بابا نہیں، بلکہ کوئی ملنگ نما آدمی تھا۔اس نے انہیں اندر آنے کا راستہ دیا اور پھر غڑاپ سے اندرونی دروازے میں غائب ہوگیا۔چند لمحوں کے بعد ہی اسی دروازے سے پیر بابا برآمد ہوئے۔

دونوں ماں بیٹیوں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی پیر بابا کے چہرے پر رونق سی

آ گئی۔ایک عجیب سی چمک تھی جسے کوئی معنی یا مفہوم نہیں پہنایا جا سکتا تھا۔
کبریٰ نے احوال کہہ سنایا تو پیر بابا نے اندرونی حصے کی طرف منہ اٹھا کر آواز دی۔
''جیرا سائیں......! ذرا باہر تو نکلو......!'' چند لمحوں کے بعد ایک اور ملنگ نما آدمی باہر نکلا تو پیر بابا نے کہا۔
''بچی کو اندر حجرے میں بھیج دو اور تم دونوں یہاں باہر والے کمرے میں رہو گے۔''
''جاؤ لڑکی......! اندر چلی جاؤ......! اور بی بی......!تم جاؤ......!کل آجانا......!'' پیر بابا کی بات ختم ہوئی تو سیما اندر جبکہ کبریٰ بیرونی دروازے سے باہر نکل گئی۔
رات اپنے پر پھیلا چکی تھی اور وقت لمحہ بہ لمحہ اپنا سفر طے کر رہا تھا۔ پیر بابا کے ڈیرے پر مکمل خاموشی کا راج تھا۔ پھر تقریباً بارہ یا ساڑھے بارہ کا وقت ہوگا جب پیر بابا کے ڈیرے سے ایک بھیانک چیخ سنائی دی اور اس چیخ میں حیرت، بے یقینی، خوف، کرب و اذیت اور نہ جانے کون کون سی کیفیات شامل تھیں۔
صرف محسوس کرنے والی سماعت کی ضرورت تھی لیکن وہ یہاں دور دور تک دستیاب نہ تھی۔ پھر ایک اور چیخ بلند ہوئی جو پہلے سے زیادہ زوردار تھی۔ اس کے بعد خرخرخر کی عجیب سی آواز سنائی دی۔ پھر بھاگتے قدموں کی آواز...... اس کے بعد خاموشی...... گہری خاموشی......
چیخیں پہلے بھی گونج چکی تھیں...... چیخیں آج بھی گونجی تھیں لیکن فرق یہ تھا کہ شکاری آج خود شکار بن گیا تھا...... آج یہ چیخیں پیر بابا کی تھیں۔

☆☆☆

آج سیما کی رہائی کا دن تھا لیکن وہ رہا ہونا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے جیلر سے درخواست کی کہ اسے رہائی نہیں چاہئے۔ اسے یہیں رہنے دیا جائے لیکن ایسا

کیسے ممکن تھا......؟ اس کی سزا ختم ہو چکی تھی۔ رہا تو اسے ہونا ہی تھا۔

وہ جانتی تھی کہ باہر کی دنیا میں اب اس کے لئے کچھ نہیں ہے۔ کوئی اس کی رہائی پر خوش ہونے والا، کوئی اس کے ساتھ چلنے والا موجود نہیں ہے۔

ظفر کی شادی ہو چکی تھی۔ اس کے دو بچے تھے۔ ڈیڑھ سال پہلے اسے یہ اطلاع بھی مل چکی تھی کہ اس کی ماں اب اس دنیا میں نہیں رہی۔ بھلا وہ رہا ہو کر کرتی بھی کیا......؟ کوئی آسرا کوئی سہارا نہیں تھا۔ کوئی رشتہ موجود نہیں تھا جو اس کا منتظر ہوتا جو اس کی رہائی کا انعام ہوتا، کوئی آنکھ اس کی راہ تکنے والی نہیں تھی لیکن ایسا نہیں تھا، یہ اس کی غلط فہمی، اس کی اپنی سوچ تھی۔ ایک آنکھ آج بھی اس کی منتظر تھی۔ ایک شخص آج بھی اس کی راہ تک رہا تھا۔

بچے کو سینے سے لگائے جونہی وہ جیل کے دروازے سے باہر نکلی، دو آنکھیں اسے منتظر ملیں جو صرف اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ وہ شخص صرف اس کے لئے وہاں کھڑا تھا۔ سیما کا دل زور سے دھڑکا۔ اس کے پورے وجود میں جیسے طمانیت کی ایک لہر سی اتر گئی۔

خوشیاں اس سے روٹھی نہیں تھیں۔ وہ تو اس کی منتظر تھیں۔ آج اسے سمجھ آگئی تھی کہ وہ اس سے ملنے بار بار کیوں آتا تھا؟ بے اختیار اس کی آنکھوں میں اپنے مالک کے لئے تشکر کے آنسو آگئے۔ اس کے حصے کا سکھ، اس کے حصے کی خوشیاں، اس کا نصیب، اس کی منزل اس کے سامنے تھی اور سیما اتنی نادان نہیں تھی کہ اب بھی نہ سمجھ پاتی۔ اس نے سیما کے قریب آکر اپنے دونوں ہاتھ بڑھائے تو سیما نے اپنے سینے سے لپٹا وہ ننھا پھول اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے اسے اپنے سینے سے لگایا اور پھر اس کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگا۔ وہ آصف تھا...... ایڈووکیٹ آصف ملک......!

☆☆☆

آرزو عیب نہیں

وسل کی آواز سنائی دی اور پھر فولادی ریلوے ٹریک سے رگڑ کھاتے ٹرین کے وزنی پہیوں نے پلیٹ فارم چھوڑ دیا۔اس کے ساتھ ہی اس کے ہونٹوں سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور اس کے تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

اب وہ مطمئن تھی۔گہرے بلیو کلر کے شلوار سوٹ میں ملبوس آنکھوں پر گاگلز لگائے سر پر دوپٹہ اوڑھے،وہ بہت خوب صورت نظر آ رہی تھی گو کہ اس کا چہرہ کسی بھی قسم کے میک اپ سے عاری تھا لیکن اس کے دمکتے رخسار، عنابی ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں، غلافی پلکیں، گولڈن براؤن گہرے لمبے بال، اکانومی کلاس کے اس کمپارٹمنٹ میں اسے سب سے نمایاں اور ممتاز حیثیت کا حامل بنا رہے تھے۔لیکن حسن و سادگی کا وہ مجموعہ اپنے ہی خیالوں میں گم کھڑکی سے باہر تیزی سے بھاگتے ہوئے مناظر پر نظریں جمائے کسی سنگی مجسمے کی طرح ساکت اور خاموش تھا۔

ٹرین اب پوری رفتار سے بھاگی چلی جا رہی تھی اور شاید اتنی ہی تیزی سے اس کا دماغ بھی حرکت میں تھا۔

مخملی . شام میں اکثر سر صحرا کوئی
مجھ پہ کرتا رہا میری طرح گریہ کوئی

یہ تیرا ہجر ہے یا رحل پہ رکھا ہوا دکھ
یہ کوئی تو ہے کہ بے جسم جنازہ کوئی
ریل کی پٹڑی پہ چلتے ہوئے وقت رخصت
رو پڑا دے کے مجھے رات دلاسا کوئی
میرے ہونٹوں پہ تھی ہجرت کی مقدس آیت
رات پیروں سے لپٹتا رہا سایہ کوئی

ٹرین کے پہیے چرچرائے اور پھر اس کی رفتار دھیمی پڑنے لگی۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین ایک جھٹکے سے رکی تو وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ "لانڈھی" اسٹیشن تھا۔

چند لمحوں کے بعد دھپ کی آواز سنائی دی تو اس نے چونک کر دائیں جانب دیکھا۔ کھچڑی بالوں والی ایک بھاری بھرکم خاتون اس کے برابر آ بیٹھی تھیں جن کا منہ جگالی کرنے کے انداز میں مسلسل چل رہا تھا۔ شاید وہ پان تناول فرما رہی تھیں۔ ٹھیک اسی وقت ایک ہچکولہ سا لے کر ٹرین دوبارہ چل پڑی تو وہ بھی دوبارہ کھڑکی سے باہر متوجہ ہوگئی لیکن وہ زیادہ دیر تک اپنا انہماک قائم نہ رکھ سکی۔

"اے کہاں جا رہی ہو بیٹا......؟" پھٹے بانس جیسی وہ کرخت آواز یقیناً وارد خاتون کی تھی۔ اس نے ایک نظر ان کی طرف دیکھا اور پھر بولی۔

"جی...... پنجاب......!"

"کراچی میں رہتی ہو......؟" بڑی بی نے ایک اور سوال داغا۔

"جی......!" اس نے مختصر جواب دیا۔

"اچھا اچھا......! بڑا لمبا سفر ہے پنجاب کا...... میں تو حیدر آباد تک جاتے جاتے ہی تھک جاتی ہوں۔ چولیں ہل جاتی ہیں جسم کی۔ پنجاب کا تو بیس گھنٹے کا بنتا ہے۔ اللہ بخشے نوید کے ابا زندہ تھے تو میں بھی پنجاب جایا کرتی تھی۔"

بڑی بی نے اپنی منزل کا پتا دینے کے ساتھ ساتھ اس کی معلومات میں بھی اضافہ کیا اور وہ سوچ رہی تھی کہ نوید یقیناً ان کا بیٹا ہوگا اور اس کے ابا یقیناً بڑی بی

کے شوہر نامدار ہوں گے جو بڑی بی کو پنجاب لے جایا کرتے ہوں گے۔

اب وہ اس دنیا میں نہیں تھے جس کی وجہ سے بڑی بی صرف حیدر آباد
کا سفر کرنے پر مجبور تھیں یا شاید چولیں ہلنے سے خوفزدہ تھیں اس لئے پنجاب نہ
جاتی تھیں۔ بہرحال جو بھی ہو میری بلا سے، اس نے کندھے جھٹکتے ہوئے سوچا لیکن
بڑی بی اتنی آسانی سے اس کی جاں بخشی پر آمادہ نظر نہیں آ رہی تھیں۔

''پڑھتی ہو......؟'' بڑی بی کا اگلا سوال تھا اور وہ زچ ہوگئی۔ بعض لوگ
کون میں خواہ مخواہ'' کے مصداق بلاوجہ ہی کمبل ہو جاتے اور بلائے جاں کی طرح
نازل ہوتے ہیں۔

بڑی بی بھی اسی قبیل سے تعلق رکھتی تھیں جو یہ جانے بغیر کہ اگلا بندہ ا
سے بات کرنے کے موڈ میں ہے یا نہیں۔ خواہ مخواہ ہی بے تکلف ہوئی جا ر
تھیں۔ وہ تو پہلے ہی پریشان تھی، جتنا بڑا قدم اس نے اٹھا لیا تھا اس کی جگہ کو
اور لڑکی ہوتی تو شاید ایسا سوچ بھی نہ سکتی۔ اندیشے......وسوسے، خوف و ہراس
منصوبہ بندی اور نہ جانے کیا کیا اس کے دماغ میں کھچڑی کی طرح پک رہا تھا
بڑی بی تھیں کہ اس کے دماغ کی دہی کئے جا رہی تھیں۔

''جی نہیں......!'' اس نے صبر کے گھونٹ بھرتے ہوئے قدرے ترشی سے
کہا لیکن بڑی بی بھی ایک ہی تھیں، انہوں نے اس کے لہجے اور رویے کو ذرا بھ
محسوس کئے بغیر اپنے پنڈورا باکس سے اگلا سوال برآمد کیا اور بڑے رسان سے
دیا۔

''اچھا...... کرتی کیا ہو......نوکری......؟'' اور اس کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔

''پکوڑے بناتی ہوں۔'' وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی تو بڑی بی
منہ حیرت سے کھل گیا لیکن اگلے ہی لمحے انہوں نے شاید اپنی ذمہ داری کے بوجھ
محسوس کیا اس لئے فوراً ہی ان کا منہ دوبارہ بند ہوگیا اور وہ گویا ہوئیں۔

''اچھا اچھا......! اللہ بخشے نوید کے ابا بھی پکوڑوں کے بڑے شوقین تھ

جب تک زندہ رہے میرے ہاتھ کے پکوڑے کھاتے رہے اور اب نوید بھی بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔'' اور اس مرتبہ منہ کھولنے کی باری اس کی تھی اور وہ حیرت سے منہ کھولے بڑی بی کو تک رہی تھی پھر وہ سراسراتے ہوئے لہجے میں بولی۔

''یہ نوید کون ہے......؟''

''اے میرے شوہر ہیں۔'' بڑی بی فخریہ انداز میں بولیں تو اس کی آنکھوں کے ڈھیلے عجیب سے انداز میں حرکت کرنے لگے پھر اس نے بے اختیار پوچھا۔

''اور یہ اللہ بخشے...... مم...... میرا مطلب ہے نوید کے ابا......؟'' اور دوسرے ہی لمحے جیسے زلزلہ آ گیا۔ اس نے گھبرا کر بغور بڑی بی کے تھل تھل کرتے پہاڑ جیسے جسم پر نظریں جما دیں۔ کافی دیر میں اسے اندازہ ہوا کہ ٹرین میں زلزلہ نہیں آیا بلکہ بڑی بی ہنس رہی ہیں اور ان کا پورا وجود ان کے ساتھ ہنس رہا ہے۔ اعضاء کی شاعری شاید اسی کو کہا جاتا ہے اور جس کسی نے بھی کہا ہوگا یقیناً اس کی ملاقات ان بڑی بی سے ضرور ہوئی ہوگی۔

''اے لو......!'' بڑی بی نے ہنسی کے دوران بمشکل کہا اور پھر ہنسی کو کنٹرول کرنے لگیں۔ جس طرح ٹرین کو بریک لگائی جائے تو وہ بہت دور جا کر رکتی ہے۔ بالکل اسی طرح بڑی بی کی ہنسی بھی کافی دیر میں رکی۔

''تم بھی نری چغد ہو، نوید میرے شوہر ہیں تو ان کے ابا میرے سسر ہوئے نا...... ہوئے کہ نہیں......؟'' بڑی بی نے تائیدی نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا تو اس نے جلدی سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

بڑی بی کی دکھائی دینے والی پان میں لتھڑی ادھ کھلی بتیسی ثابت کر رہی تھی کہ وہ مسکرا رہی ہیں اور وہ ...... وہ واقعی اپنے آپ کو نری چغد محسوس کر رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔

☆☆☆

اس کے حلق میں کانٹے پڑنے لگے تو اس کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں آپ ہی

آپ ھلتی چلی گئیں۔ بوسیدہ پلنگ، شکستہ ٹیبل اور پھر اس پر رکھا ہوا وہ زخمی واٹر کولر اسے دور...... بہت دور دکھائی دے رہا تھا، صدیوں کی مسافت پر......

''اچھی نوکری کے لئے اچھے مارکس ہونا کافی نہیں ہوتا برخوردار......! کوئی سفارش ہے......؟'' اس عیار صورت بوڑھے نے پوچھا تو اسے کہنا پڑا۔

''نو سر......!'' بوڑھا اس کی فائل پر نظریں جمائے اس میں سے جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کر رہا تھا پھر اس کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔

''کچھ خرچ کر سکتے ہو......؟''

''نو سر......!'' اس کا جواب حسب سابق تھا۔

''کوئی تجربہ ہے......؟'' بوڑھے نے مزید دریافت کیا۔

''نو سر......!'' اس کا جواب وہی تھا۔

''مسٹر سانول قزلباش......! کیوں اپنا اور میرا وقت برباد کر رہے ہو......! اٹھاؤ اپنے یہ کاغذات اور نکلو یہاں سے......'' عیار صورت بوڑھے نے فائل اس کے منہ پر کھینچ ماری تھی۔ اس کے حلق سے ایک سسکاری سی نکل گئی۔ اس نے کرب آمیز انداز میں آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن آنکھیں بند کر لینے سے بلی غائب تو نہیں ہو جاتی۔

حلق میں پڑتے ہوئے کانٹے اور پیاس کی شدت بھوک پر غالب آ گئی تھی لیکن پتا نہیں کیوں پردہ ذہن سے ابھی مناظر کے نقوش دھندلے کرنے میں ناکام رہی تھی۔ جب وہ ان خیالات سے چھٹکارا نہ پا سکا تو پریشان ہو کر اس نے آنکھیں کھول لیں۔

واٹر کولر بدستور اتنے ہی فاصلے پر اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ ہمت تو کرنا ہی تھی، وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھا اور پھر ہمت مجتمع کرتے ہوئے پانی کے کولر کی طرف بڑھا۔ وہ شدید نقاہت محسوس کر رہا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پانی تو اسے اٹھ کر ہی پینا تھا۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا اور پھر کولر کی ٹونٹی پریس کی،

پانی پی کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا۔ اس نے گلاس واپس رکھا اور کمرے کی ابتر حالت پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے دوبارہ پلنگ پر جا بیٹھا۔

''مسٹر سانول قزلباش......! اٹھاؤ اپنے یہ کاغذات اور نکلو یہاں سے۔''

اس نے دونوں ہاتھ اپنے کانوں پر رکھ لئے جیسے سنائی دینے والی اس آواز سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہو۔ لیکن وہ آواز تو اس کی سماعتوں سے چپک کر رہ گئی تھی۔

کمرے میں تو دوسرا کوئی ذی روح موجود ہی نہیں تھا۔ یہ آواز تو اس کے اندر سے اٹھ رہی تھی۔ جو اس کی نس نس کو جھلسائے دے رہی تھی اس کا روم روم زخمی کر رہ گیا تھا اور ایسا پہلی بار تو نہیں ہوا تھا۔ پچھلے تین مہینوں سے یہی سب کچھ تو ہو رہا تھا۔ چھوٹے سے اس شہر کی ہر اس جگہ جہاں نوکری ملنے کی امید تھی، اس نے چکر پہ چکر لگائے تھے اور ہر جگہ مایوسی اور ناکامی نے اس کا تعاقب کیا تھا۔

اس کا باپ سبزی کا ٹھیلا لگاتا تھا۔ لیکن جب تک زندہ رہا اس نے اس کی تمام ضروریات کا خیال اپنی بساط سے بڑھ کر رکھا تھا اور کیوں نہ رکھتا، اس کا اکلوتا بیٹا تھا اور وہ بھی بن ماں کا۔

سانول کی ماں اس کے بچپن میں ہی اسے باپ کے سہارے چھوڑ گئی تھی اور اس نے اسے کبھی بے سہارا ہونے کا احساس تک نہ ہونے دیا تھا۔ لیکن کب تک......؟ موت تو ایک تلخ حقیقت ہے جس کے آگے کسی کی نہیں چلتی۔ کوئی جذبہ، کوئی رشتہ اس کے راستے کی رکاوٹ نہیں بن سکتا۔ سو یہاں بھی اس نے کام دکھایا اور سانول بے سائبان ہو گیا۔ لیکن وہ گھبرایا نہیں، اونچا لمبا گبھرو جوان تھا وہ، خوب صورت تھا، پڑھا لکھا تھا۔

''بہت ترقی کرے گا میرا بیٹا......! بڑا نام اور بڑا پیسہ کمائے گا۔'' اس کے باپ نے اس کی فراخ پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا اور سانول کا ہاتھ بے اختیار اپنی پیشانی پر پہنچ گیا۔ لیکن وہ لمس، وہ وجود تو اس دنیا میں موجود ہی نہ تھا۔

سانول کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ سبزی کا ٹھیلا لگانے

والے کا بیٹا اور گریجویشن......؟ دو متضاد چیزیں ہیں نا......؟ لیکن ایسا ہوا
سانول گریجویٹ تھا۔

''لیکن کیا فائدہ......؟'' سانول نے دکھ سے سوچا۔ پچھلے تین مہینے
اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس نے صرف وقت ضائع کیا ہے اور تین دن
اس نے کھایا بھی تو کچھ نہیں تھا۔

''کیا کروں اس ناکارہ وجود کا......؟ جو اپنے لئے ایک وقت کا کھانا
مہیا نہیں کر سکتا......؟''

وہ سوچ رہا تھا ٹھیک اسی لمحے ٹرین کی آواز سنائی دی۔ ریلوے انجن
وسل...... اور اچانک ہی سانول کے ذہن میں پھل جھڑی سی چھوٹی اور پھر دھیر
دھیرے یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہوتا چلا گیا۔

''اس کے علاوہ اور کوئی چارہ بھی تو نہیں......؟ یہ بہترین حل ہے۔''
نے مایوسی اور شکستگی کے درمیان جھولتے ہوئے سوچا اور پھر فیصلہ کن انداز میں
کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ گھر سے باہر نکل رہا تھا پھر کچھ ہی لمحوں کے بعد وہ ریلو
اسٹیشن کی جانب چلا جا رہا تھا اور یہ انتہائی فیصلہ کرنے کے بعد وہ پوری ط
مطمئن تھا۔ اس کی نظر میں یہ ایک بہترین فیصلہ تھا اور ٹرین اس کی بہتہ
معاون...... بس اسے ٹرین کی پٹڑی پر لیٹنا تھا، ٹرین نے چلنا تھا اور پھر......

☆☆☆

جیل کے دروازے سے اندر داخل ہونے کے بعد اسے پہلی صورت
کانسٹیبل کی نظر آئی تھی جو اسے ریسیو کرنے کے بعد اب اسے ''چکر'' کی ط
لے جا رہی تھی اور وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ''چکر'' کیا چیز ہے......؟ پھر اسے ایک
کے سامنے روکتے ہوئے بولی۔

''جاؤ ''چکر'' میں جا کر اپنا اندراج کرواؤ۔'' اور وہ طویل سانس لیتی
اس دفتر میں داخل ہو گئی جو بقول لیڈی کانسٹیبل کے ''چکر'' تھا۔

''نام......؟'' اس نے سوالیہ انداز میں پوچھا اور وہ اس کرخت صورت
بڑھیا کی طرف دیکھتی رہ گئی جو وردی پہنے بڑے طمطراق سے ریوالونگ چیئر پر
براجمان تھی۔

''اونچا سنتی ہے کیا......؟ میں اپنا سوال دوہرانے کی عادی نہیں......
بھی......!نام بولو اپنا......؟'' اور اس نے ہاتھ میں موجود کارڈ اس کے سامنے رکھ
دیا۔ کرخت صورت بڑھیا نے ایک نظر کارڈ کی طرف دیکھا پھر میز پر پڑی بید کی
چھڑی اٹھاتے ہوئے بولی۔

''میں نے تیرا گتا نہیں مانگا، مجھے پتا ہے کہ اس پر تیرے کرتوت درج
ہیں، منہ سے بھونک نام......؟'' اور وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔

''حبا چوہدری......!''

''جرم......؟'' کرخت صورت بڑھیا نے اگلا سوال کیا۔

''302......!'' حبا نے لاپرواہی سے کہا تو کرخت صورت بڑھیا سنبھل کر
بیٹھ گئی۔ اس نے کارڈ اٹھا کر غور سے دیکھا اور پھر بغیر کچھ کہے ایک رجسٹر کھول کر
اس میں کچھ اندراجات کرنے لگی۔

''نور جہاں......!'' بڑھیا نے آواز دی تو وہی بدصورت لیڈی کانسٹیبل اندر
داخل ہوئی جس نے اسے ریسیو کیا تھا اور جیل میں اس کی پہلی میزبان تھی۔

''نشان لو اس کے......!'' کرخت صورت بڑھیا نے بدصورت لیڈی
کانسٹیبل سے کہا جو بقول اس کے نور جہاں تھی۔ پھر طوعاً وکرہاً دونوں ہاتھوں کی
تمام انگلیوں کے نشانات ایک رجسٹر پہ ثبت کرنے پڑے۔ اس کے بعد اس کی
قد ماپی گئی، ٹھیک اسی لمحے ایک دلدوز چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر جیسے چیخوں
کی مشین اسٹارٹ ہوگئی۔ حبا نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا پھر اس کی نظریں کرخت
صورت بڑھیا کے چہرے پر جم گئیں، جس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ تھی۔
شرارت سے بھرپور...... پھر وہ میز کے پیچھے سے نکلی اور بولی۔

پاکستان ورچوئل لائبریری

''باہر نکلو......!'' اور حبا پلٹ کر تیزی سے باہر نکلی۔ جیل کے احاطے کی سینٹر
میں موجود تھا۔ یہ دفتر جسے چکر کہا جاتا تھا، چکر کے دروازے کے قریب ہی زمین
میں درخت کا ایک تنا گاڑا گیا تھا۔ اس کے اوپر بھی ایک تنا اس انداز میں نصب کیا
گیا تھا کہ دور سے دیکھنے پر وہ دونوں تنے مل کر صلیب کا سا تاثر دے رہے تھے۔
لیکن دیکھنے کی بات یہ تھی کہ اس وقت تنے پر ایک عورت کو اس انداز میں اوندھا
باندھا گیا تھا کہ اس کے دونوں بازو دونوں سائیڈوں پر کر کے اوپر رکھے تنے سے
باندھے گئے تھے۔ ایک لمبی تڑنگی گرانڈیل عورت جس کے بازوؤں کے مردوں کے
مسلز تھے اس کے ہاتھ میں بید کی ایک لمبی چھڑی تھی جو بھیگی ہوئی بھی نظر آ رہی
تھی۔

گرانڈیل عورت باؤلنگ کروانے کے اسٹائل میں دور سے بھاگتی ہوئی آئی
اور اس کے ہاتھ میں موجود چھڑی شڑاپ کی آواز کے ساتھ بندھی ہوئی عورت کے
وجود سے ٹکرائی اور وہاں سے خون آلود دھار سی بلند ہوئی۔ گرانڈیل عورت جو
کانسٹیبل کی وردی میں تھی، لذت آمیز انداز میں چند لمحے اچھل کود مچاتی رہی پھر
اس نے دوبارہ اسٹارٹ لیا اور بید کی وہ منحوس چھڑی ایک مرتبہ پھر شڑاپ کی آواز
کے ساتھ چھینٹے اڑے اور بندھی ہوئی عورت کی گردن ڈھلک گئی۔ اس کی چیخوں کو
بریک لگ چکا تھا۔

حبا نے بے اختیار ایک جھرجھری سی لی لیکن دوسرے ہی لمحے وہ لڑکھڑا کر رہ
گئی۔ اس کی گدی پر ایک دھماکہ سا ہوا تھا جو اس بات کا ثبوت تھا کہ اسے ایک
زور دار دھپ رسید کی گئی ہے۔

وہ تیزی سے پلٹی۔ کرخت صورت بڑھیا کی آواز بند ہو رہی تھی۔

''یہاں اکڑفوں نہیں چلتی، جو اکڑ باز ہوتی ہے ان کا انجام یہی ہوتا ہے،
بھینس کی طرح ڈکراتی ہیں پھر...... یہاں صرف حکم کی تعمیل کرے گی تو اچھی رہے
گی...... سمجھی......!'' اور پھر وہ کانسٹیبل سے مخاطب ہوئی۔

''نورجہاں......!اسے بیرک نمبر 5 میں چھوڑ دو۔''

''یس میڈم......!'' نورجہاں نے کہا اور پھر اس کا بازو پکڑ کر ایک طرف چلنے لگی۔حبا نے اردگرد نظریں دوڑائیں تو اسے جابجا قیدی عورتیں چلتی پھرتی نظر آئیں۔لیکن ساتھ ہی اکثر مقامات پر خواتین پولیس اہلکار بھی نظر آ رہی تھیں۔

حبا کو محسوس ہوا کہ ہر آنکھ اسے گھور رہی ہے اور ہر کوئی اس کی طرف متوجہ ہے۔ یہ صرف اس کا احساس تھا یا حقیقتاً ایسا ہی تھا۔ ابھی وہ اس کا فیصلہ بھی نہ کر پائی تھی کہ اس کی رہنمائی کرنے والی لیڈی کانسٹیبل اسے لئے ایک راہ داری میں داخل ہوگئی جس کے دونوں طرف سلاخ دار دیواریں نظر آ رہی تھیں جن کے عقب میں بڑے۔بڑے ہال کمرے سے بنے ہوئے تھے جن کے بھاری آہنی دروازے بھی سلاخ دار تھے اور جن پر نمبر پڑے ہوئے تھے۔

نورجہاں ناک کی سیدھ میں چلی جا رہی تھی۔جبکہ حبا اردگرد کے ماحول کا بغور مشاہدہ کر رہی تھی۔اچانک سامنے سے پولیس کی وردی میں ملبوس ایک اور بھاری بھرکم بھدے نقوش والی عورت نمودار ہوئی تو نورجہاں نے اسے سلام کیا۔ دونوں نے رک کر ایک دوسرے کا حال دریافت کیا پھر بھدے نقوش والی عورت کی نظر حبا پر پڑی تو اس نے نظروں ہی نظروں میں جیسے اس کا ایکسرے کر ڈالا۔ پھر وہ نوجہاں سے مخاطب ہوئی۔

''ارے نورجہاں......! یہ نئی چڑیا کون ہے......؟'' اور نورجہاں نے کہا۔

''پانچ نمبر کی نئی مہمان ہے۔ تین سو دو میں آئی ہے۔ چل تیرے ''ڈھیئے'' کا اضافہ تو ہوا کشور......!'' اس کی بات سن کر دونوں ہنسنے لگیں اور حبا کو نئی کانسٹیبل سے آگاہی ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نئے لفظ سے بھی آشنائی حاصل ہوئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ''ڈھیا'' کیا بلا ہے......؟

''چل مہارانی......! آگے چل...... تجھے تیرے شیش محل تک پہنچا دوں۔'' نورجہاں اس سے مخاطب ہوئی تو اس نے قدم آگے بڑھا دیئے۔ جبکہ کشور وہیں

کھڑی اس کی پشت کو گھور رہی تھی۔ پھر ایک دروازے پر پانچ کا ہندسہ نظر آیا تو نور جہاں کے قدم رک گئے۔

''چل مہارانی......! یہ ہے تیرا رین بسیرا......!'' نور جہاں نے اسے کمرے میں دھکیلتے ہوئے کہا اور خود واپس مڑ گئی۔ یقیناً یہی بیرک نمبر پانچ تھا۔ جونہی اس نے قدم بڑھائے اس کے کانوں سے ایک سریلی آواز ٹکرائی۔

چھمک چھلو، ذرا دھیرے چلو
ورنہ جاؤ گی پھسل
لچک جائے گی پتلی کمر
چھمک چھلو ہو او، او، او

کمرے میں دونوں دیواروں کی لمبائی کے ساتھ ساتھ فرش پر بستر بچھے ہوئے نظر آ رہے تھے جن پر تکیے دیوار کی سمت رکھے گئے تھے درمیان میں ایک راہ داری سی بنی ہوئی تھی جس کے دونوں اطراف بھانت بھانت کی رنگ برنگی عورتوں کے پاؤں تھے۔ ہر نظر اسی پر جمی ہوئی تھی اور پھر اسے وہ سریلی آواز والی دھان پان سی خوب صورت لڑکی بھی نظر آ گئی جو کہنیاں زمین پر ٹکائے دونوں ہتھیلیوں میں چہرہ سجائے اسی کی طرف متوجہ تھی اور آنکھیں مٹکا مٹکا کر تان بلند کر رہی تھی۔

چھمک چھلو، ذرا دھیرے چلو

پھر ایک بھاری بھرکم عورت تیزی سے اٹھ کر اس کے قریب آ گئی اور بولی۔

''حضور والا......! کون سا کام کیا جو یہاں تشریف آوری ہوئی......؟''

''نام کیا ہے......؟'' ایک دوسری عورت نے قریب آ کر پوچھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی اور پھر بولی۔

''حبا چوہدری......!''

''حبا کسے کیا ذبح......؟'' پہلی والی نے ہونٹ سکیڑتے ہوئے پوچھا اور وہ

مسکرا کر رہ گئی۔ ذرا سی دیر میں اس کے اردگرد اچھا خاصا ہجوم جمع ہوگیا تھا پھر اس کی نظر سریلی آواز والی اس دھان پان سی لڑکی پر پڑی جو تیزی سے اس کے قریب آئی اور پھر چیل کی طرح اس پر جھپٹی، اس نے گھبرا کر دونوں ہاتھ آگے کیئے تو اس نے اس کے ہاتھ میں موجود کارڈ پر حملہ کر دیا اور پھر اگلے ہی لمحے کارڈ اس کے ہاتھ میں تھا اور شاید اس کا ہدف بھی یہی تھا۔

''قتل میں آئی ہے۔'' اس کے حلق سے مسرت آمیز نعرہ بلند ہوا جبکہ نظریں بدستور کارڈ پر پھسل رہی تھیں۔ پھر وہ تیزی سے اس کے قریب آئی اور اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولی۔

''شاباش......! یہ کیا نا مردوں والا کام......! اگر چوری، ڈکیتی یا عاشقی معشوقی میں آتی تو سب کی خدمت ہی کرتی لیکن اب ایسا نہیں ہوگا۔ سنو......! ہٹو سب ہٹ جاؤ......! آج سے یہ نوری کی ''کھڈے وال'' ہے۔'' اور وہ سوچ کر رہ گئی کہ اب یہ ''کھڈے وال'' کس بلا کا نام ہے......؟ اور وہ سب تتر بتر ہونے لگیں پھر وہ بھاری بھرکم عورت جاتے جاتے مڑ کر بولی۔

''خیال کرنا چوہدرانی......! یہ نوری بڑی ''رنگ باز'' ہے۔ پھر نہ کہنا کسی نے بتایا نہیں۔'' نوری نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ جلدی سے آگے بڑھ گئی۔ حبا آہستہ قدموں سے چلتی ہوئی نوری کے ساتھ اس کے بستر پر آ بیٹھی۔ جس کے سرہانے کی سائیڈ پر ایک ڈھکن لگا کنستر رکھا ہوا تھا جس پر کالا رنگ کیا گیا تھا اور سفید رنگ سے لکھا ہوا تھا۔

''نوری ولد غلام باری، بیرک نمبر 5''

پھر اس کی نظروں نے مزید گردش کی تو اسے معلوم ہوا کہ دیوار کے ساتھ ایسے ہی کنستر قطار در قطار ہر بستر پر موجود ہیں۔

''پتا ہے جب چکر میں حوالدارنی نے تجھے تھاپ ماری تھی اور تو گرتے گرتے بچی تھی۔ میں نے تجھے تبھی دیکھ لیا تھا۔ گئی تو تھی بالی کو دیکھنے پر نظر آئی

تو......!''

نوری نے کہا تو حبا کو اندازہ ہوگیا کہ وہ تھاپ کسے کہہ رہی ہے اس کا ہاتھ بے اختیار اپنی گدی سہلانے لگا۔

''یہ بالی کون ہے......؟'' حبا نے سوال کیا۔

''ارے وہی...... جسے ٹکٹکی پر باندھ کو کوڑے لگائے جا رہے تھے۔ بڑی ہی ''ڈنگی'' (ٹیڑھی) عورت ہے۔اس نے کٹ سے وار کر کے شائنل کو زخمی کر دیا تھا۔ جیلر صاحبہ کے حکم سے اسے کوڑے لگائے جا رہے تھے پر وہ بیہوش ہونے کا ڈرامہ کرگئی۔'' نوری نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

''اچھا یہ ''کٹ'' کیا چیز ہے......؟'' اس نے سوال کیا تو نوری گریبان میں ہاتھ ڈال کر کچھ ٹٹولنے لگی پھر جب اس نے ہاتھ باہر نکالا تو اس کے ہاتھ میں اسٹیل کا ایک چمچہ تھا جس کی ڈنڈی والی پتلی سائیڈ کو گھس کر تیز دھار کی شکل دے دی گئی تھی۔

''یہ کٹ ہے۔'' نوری نے اسے دکھانے کے بعد چمچہ واپس محفوظ کرلیا تھا۔
ٹھیک اسی لمحے کشور نامی عورت کمرے میں داخل ہوئی اور ڈنڈا لہرا کر بولی۔

''چلو چلو...... گنتی کرواؤ...... چلو......!'' اور سب اٹھ کر بھیڑ بکریوں کی طرح باہر نکلنے لگیں۔وہ اور نوری بھی باہر نکل کر قطار میں شامل ہوگئیں۔ گنتی کے بعد انہیں واپس بیرک میں داخل کیا گیا اور اس کے دروازے پر باہر سے تالا ڈال دیا گیا۔

''گنتی روزانہ صبح و شام دونوں وقت ہوتی ہے۔ شام کو گنتی کے بعد یہ دروازہ بند کر دیا جاتا ہے اور صبح کھلنے کے بعد پھر گنتی کی جاتی ہے۔'' نوری نے رضا کارانہ طور پر اسے معلومات فراہم کیں۔

''اچھا نوری......! یہ ''کھڈے وال'' کیا ہوتا ہے......؟'' حبا نے پوچھا۔

''کھڈا ہم بستر کے لئے مخصوص جگہ کو کہتے ہیں اور اس جگہ پر رہنے والے ساجھے دار ''کھڈے وال'' ہوتے ہیں۔'' نوری نے جواب دیا۔

''اچھا..... ایک بات اور بتاؤ یہ ''ڈھیا'' کیا ہوتا ہے.....؟'' حبا نے ایک ایک کر کے اپنی ساری الجھنیں دور کرتے ہوئے لجاجت آمیز انداز میں سوال کیا۔ تو نوری پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''ارے چوہدرانی.....! سب کچھ آج ہی پوچھ لے گی.....؟ چل تو بھی کیا یاد کرے گی..... ''ڈھیا'' یہاں موجود پولیس والیوں کی اوقات کا نام ہے۔ صرف دس کا نوٹ دے دو اور مزے کرو۔ دس کے نوٹ کو جیل کی زبان میں ''ڈھیا'' کہتے ہیں۔'' حبا اس کے جواب سے مطمئن ہوگئی۔

''نوری.....! تم گاتی بہت اچھا ہو۔'' اس نے مسکہ لگایا۔

''اچھا.....؟'' نوری خوش ہو کر بولی۔

''چل پھر تجھے گانا سناتی ہوں۔'' اس نے کنستر اٹھا کر گود میں رکھا اور پھر سلاخوں کے پیچھے اس کی آواز بلند ہونے لگی۔ کنستر میوزک دے رہا تھا۔

اللہ جانے وے ماہی، وے تیرا پیار کی اے
وے دل دی اداسی نئیں جاندی
ہو دل دی اداسی نئیں جاندی
کم کرنا ہندا ہو کوئی میں ہو کوئی کر لینی آں
میں جاناں ہندا ہو کتے میں تیرے ول ٹر پینی آں
اللہ جانے وے ماہی تیرا پیار کی اے

جیل کا پرہیبت ماحول، اسیری کا احساس، رات کی تاریکی، سناٹا اور نوری کی سریلی آواز سماں بندھ گیا تھا سب ہی اپنی اپنی جگہ بے خودی ہو کر سر دھن رہی تھیں اور نوری تان اٹھا رہی تھی۔

جنھاں روز اڈیکاں سجناں دیا
بوہے کھلے رکھ دے نیناں دے

جنہاں نیناں نوں تانہگاں یار دیاں
اوہ نین وچارے نئیں سوندے
اللہ جانے وے ماہی، وے تیرا پیار کی اے
وے دل دی اداسی نئیں جاندی
بڑا پیارا لگ ناں ایں جدوں کول بہناں ایں
جنیں واری ماہیا مینوں اپنی تو کہناں ایں
پتہ نئیں مینوں ہندا اے ہر وار کی اے
وے دل دی اداسی نئیں جاندی

اور حبا کی آنکھیں خواب ناک ہوگئیں وہ اردگرد کے ماحول سے بے نیاز ہو چکی تھی اس کا پورا وجود اس کی سماعت بن گیا تھا۔ جہاں چاروں طرف صرف نوری کی آواز کی گونج تھی اور تخیل کے پردے پر ایک دھندلی سی شبیہ نمودار ہو رہی تھی، ایک تجسس تھا جو دھیرے دھیرے ابھر کر واضح ہوتا چلا جا رہا تھا۔ایک خوب صورت اور وجیہ صورت......!اس کے حلق سے ایک سسکاری سی بلند ہوئی۔

''سانول......!'' ادھر نوری کی آواز گونج رہی تھی۔

تیرے کولوں دور رہناں ہوگیا محال اے
ہر ویلے رہندا مینوں تیرا ہی خیال اے
سوچاں میں ہر ویلے ایہہ وچار کی اے
وے دل دی اداسی نئیں جاندی
اللہ جانے وے ماہی، وے تیرا پیار کی اے
وے دل دی اداسی نئیں جاندی
وے ڈھولا، وے سانولا، دل دی اداسی

☆☆☆

چھوٹا سا اسٹیشن تھا، ٹرین رکی تو وہ بریف کیس اٹھائے نیچے اتری اور پھر

متلاشی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسٹیشن چھوٹا ضرور تھا لیکن اب اتنا چھوٹا بھی نہیں تھا کہ پلیٹ فارم پر چہل پہل نظر نہ آتی۔ بہت سے لوگ اتر رہے تھے۔ بہت سے لوگ سوار ہو رہے تھے۔ لوگ بھاگ دوڑ رہے تھے جن میں مسافر بھی تھے، قلی بھی تھے اور سودا سلف بیچنے والے لوگ بھی۔

اس نے گہری نظروں سے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ پلیٹ فارم نمبر دو پر اتری ہے۔ پلیٹ فارم پر بنے آہنی سائبان کے آخری کنارے سے دو کا ہندسہ لٹکتا ہوا نظر آ گیا تھا۔

اسٹیشن پر تو اس وقت خاصی ہلچل اور رونق نظر آ رہی تھی لیکن اردگرد جھاڑیاں، ببول کے درخت اور سرکنڈے جنگل میں منگل کا نظارہ پیش کر رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ اسٹیشن کسی ویرانے میں واقع ہو، لیکن جو بھی تھا وہ اس اسٹیشن پر اتر گئی تھی کیونکہ شاید اس کی منزل ہی یہی تھی۔

وہ بریف کیس اٹھائے پلیٹ فارم پر بنے ایک سنگی برتھ کی جانب بڑھی اور اس پر بیٹھ گئی پھر اس نے پرس میں سے موبائل نکالا۔ نمبر پش کیا اور کان سے لگا لیا۔

''دی نمبر یو ہیو ڈائلڈ از پاورڈ آف......!'' ریکارڈنگ سنائی دینے پر اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی۔ اس نے راستے میں بھی ایک دو مرتبہ کوشش کی تھی لیکن یہی آواز سنائی دی تھی۔

''لیکن تب تو رات کا وقت تھا، اب تو دن ہے۔ پھر ایسا کیوں......؟'' اس نے حیرانی سے سوچا۔

اور پہلے تو کبھی رات میں بھی نمبر بند نہیں ہوتا تھا۔ وہ تو کئی مرتبہ ساری ساری رات بھی بات کر چکی تھی۔ اس نے ایک دو مرتبہ مزید کوشش کی، لیکن یہی صورت حال برقرار رہی پھر رفتہ رفتہ اس کی حیرانی پریشانی میں تبدیل ہونے لگی۔ اسے خود پر غصہ بھی آ رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔

''کیا کراچی سے پنجاب تک کا یہ سفر بے کار جائے گا......؟'' اس نے واپسی کا کوئی راستہ ہی نہیں رکھا تھا۔

''نہیں نہیں......! اس کے ساتھ دھوکا نہیں ہوا۔ یقیناً کوئی مجبوری ہوگئی ہوگی۔ انتظار کرنا چاہئے۔'' اس نے جیسے خود کو تسلی دی۔ لیکن کب تک......؟ ٹرین جا چکی تھی۔ پلیٹ فارم ویران ہوگیا تھا اور اب وہ اکیلی وہاں بیٹھی عجیب سی لگ رہی تھی لیکن اسے بیٹھنا ہی تھا۔ جاتی بھی تو کہاں......؟ ہاں......موبائل پر بار بار ٹرائی کر رہی تھی لیکن بے سود۔ نمبر بدستور آف جا رہا تھا۔

دو تین مزید ٹرینیں آئیں اور کچھ دیر رک کر چلی گئیں لیکن اس کی مراد بر نہ آسکی۔ نہ تو وہ آیا، جس کی وہ منتظر تھی اور نہ ہی نمبر آن ہوا۔ صبح سے شام ہوگئی تھی اور وہ......؟ اس کی پریشانی عروج پر پہنچ چکی تھی۔

اس وقت بھی ایک ٹرین اسٹیشن پر موجود تھی جب اس نے بریف کیس اٹھایا اور ٹرین کے ساتھ انجن کی سمت چلنے لگی۔ گاگلز اب اس کے آنکھوں کی بجائے پیشانی سے اوپر بالوں پر ٹکے ہوئے تھے اور اس کی غلافی آنکھوں میں اس وقت شدید پریشانی کے آثار تھے۔

وہ پل کے راستے بھی دوسری جانب جا سکتی تھی لیکن اس کا ارادہ انجن کے سامنے سے گزر کر دوسری جانب جانے کا تھا جو پلیٹ فارم کے آخری کنارے پر موجود تھا۔ جونہی وہ انجن کے اگلی حصے کی جانب بڑھی اچانک ہی دوسری جانب سے نکل کر وہ اس کے سامنے آ گیا۔ الجھے اور بکھرے ہوئے بال، شکنوں بھری مسلی ہوئی شرٹ، جس کے بٹن کھلے ہوئے۔ بڑھی ہوئی شیو......لیکن......ایک وجیہہ اور پرکشش شخصیت کا مالک جو سرنیہواڑے ریلوے ٹریک کراس کرنے کے بعد اب اس کے ساتھ ساتھ سیدھا چل رہا تھا۔ نہ جانے اس کے دماغ میں کیا آئی کہ یک دم اس کے ہونٹوں سے آواز برآمد ہوئی۔

''ایکسکیوزمی......اے ہیلو......!'' اس کی آواز سن کر اس نے ایک لمحے کو

مڑ کر دیکھا تو وہ بولی۔

''آپ ہی سے مخاطب ہوں......! پلیز......! ایک منٹ کے لئے میری بات سن لیں۔'' اور اس کے آگے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ وہ تیزی سے آگے بڑھ کر اس کے قریب پہنچ گئی اور گویا ہوئی۔

''دیکھئے میں...... میں کراچی سے آئی ہوں اور اس وقت بہت مصیبت میں ہوں۔ پلیز میری مدد کریں۔'' وہ بالکل خاموش کھڑا ایک ٹک اسے تکے جا رہا تھا، حیرت کا سا انداز تھی۔

''وہ دراصل...... یہاں میرا کوئی جاننے والا بھی نہیں ہے اور میں صبح سے پلیٹ فارم پر بیٹھی ہوں۔''

''تو میں کیا کروں......؟ واپس چلی جاؤ......!'' اس کا جواب اور لہجہ رکھائی سے بھرپور تھا۔ اسے ایک دھچکا سا لگا اور وہ ڈبڈبائی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

نال سلوک دے بول وے ماہی
اسیں ہاں پردیسی پکھی
تیں محبوب دے ویکھن کارن
بیٹھے روز امیداں رکھی
جد تک توں سانوں نظر نہ آویں
ساڈی تک تک جاوَن اکھی
غلام فریدا اوہ کدی وی نہ مڑدے
جنہاں لذت عشق دی چکھی

اسے شاید اس کی آنکھوں کا یہ عالم دیکھ کر کچھ ترس آگیا یا شاید اسے اپنے لہجے کی کڑواہٹ کا احساس ہوگیا جب وہ دوبارہ بولا تھا تو اس کا لہجہ کافی حد تک نرم تھا۔

''دیکھو میں ایک بے روزگار اور ناکارہ انسان ہوں، تین دن سے میں نے

کچھ نہیں کھایا اور سچ بتاؤں میں گھر سے اسی ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرنے کے ارادے سے نکلا ہوں۔ میرے جیسا انسان کسی کی کیا مدد کر سکتا ہے......؟ بہتر یہی ہے کہ اپنی مدد کے لئے کوئی اور راستہ ڈھونڈو، جاؤ اپنا کام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔ ٹرین چلنے سے پہلے مجھے آگے جا کر ٹریک پر لیٹنا ہے...... سمجھیں......!" اور پھر وہ ایک جھٹکے سے مڑ کر چلنے لگا اور اس کا دل جیسے مٹھی میں آگیا۔

"یہ کیسا انسان ہے......؟ نہیں نہیں......! اسے مرنا نہیں چاہئے۔" اس نے سوچا اور پھر جیسے کسی فیصلے پر پہنچتے ہوئے دوبارہ اس کی جانب لپکی۔

"اے......! ہیلو......! ایک منٹ......! میں نے بھی کل سے کھانا نہیں کھایا۔ اگر تم اپنا خودکشی کا پروگرام تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دو تو پہلے کھانا کھا لیتے ہیں، جب مرنا ہی ہے تو بندہ کھا پی کر تو مرے۔" اور وہ رک کر اسے گھورنے لگا۔

"مم...... میرا مطلب ہے کھانا میں کھلاتی ہوں تمہیں......! اس بہانے میں بھی کھالوں گی...... وہ...... دراصل میں نے کبھی اکیلے کھانا نہیں کھایا اور یہاں تو میں بالکل اجنبی ہوں۔ کسی کو جانتی تک نہیں...... سچی......!" اس نے مسکین صورت بناتے ہوئے کہا اور جملہ مکمل کرتے ہی زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"لڑکی دلچسپ ہے......!" اس نے سوچا پھر مسکراتی آواز میں بولا۔

"آؤ میرے ساتھ......!" اور وہ زمین پر سے بریف کیس اٹھاتے ہوئے بے ساختہ بولی۔

"یعنی مرنے کا پروگرام کینسل......؟" جواباً اس نے گھور کر اسے دیکھا تو وہ دوبارہ زبان دانتوں تلے دبا کر رہ گئی۔

☆☆☆

بہت سے شاپنگ بیگز اٹھائے جب سانول دوبارہ گھر میں داخل ہوا تو نیوی بلیو کلر کی شلوار سوٹ میں ملبوس وہ خوب صورت لڑکی اس کے ہمراہ تھی۔ اس نے

کمرے میں پہنچ کر تمام شاپنگ بیگز کمرے میں موجود اکلوتی ٹیبل پر رکھے اور مڑ کر لڑکی کی طرف دیکھا جو گہری نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

''میرے پاس تمہارے بیٹھنے کے لئے اس خستہ حال پلنگ کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ تم بیٹھو میں کچن میں کوئی برتن وغیرہ دیکھتا ہوں۔'' سانول نے کہا تو وہ بولی۔

''نہیں...... تم نے پہلے ہی تین دن سے کچھ نہیں کھایا اوپر سے ''قلی'' کا کام بھی کرنا پڑا ہے تمہیں۔'' اس نے شاپنگ بیگز کی طرف دیکھتے ہوئے شرارت آمیز انداز میں کہا۔

''تم بیٹھو کھانا میں لگاتی ہوں۔'' پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ میز پلنگ کے قریب رکھی تھی اور اس پر چکن بروسٹ، دہی بڑے، چپاتیاں اور کیلے سیب وغیرہ سجے ہوئے تھے اور وہ دونوں ایک ہی پلنگ پر بیٹھے ان چیزوں کے ساتھ پورا انصاف کر رہے تھے۔

''ہاں......! اب بولو......! کون ہو تم......؟ اور کیا مصیبت ٹوٹی ہے تم پر......؟'' سانول نے اسپرائٹ کا سپ لیتے ہوئے سوال کیا۔ دونوں نے ڈٹ کر کھانا کھایا تھا اور حواس بحال ہوتے ہی تجسس نے سر ابھارا تھا۔ لڑکی نے پُرخیال انداز میں اسے گھورا اور پھر ہونٹ سکوڑتے ہوئے بولی۔

''نام جان سکتی ہوں تمہارا......؟''

''سانول قزلباش......!'' اس کا جواب تھا۔ وہ چند لمحے تک اس کے چہرے کو تکتی رہی پھر بولی۔

''مسٹر سانول......! میں دنیا کے بارے میں اتنا زیادہ نہیں جانتی۔ انسانوں کو پرکھنا بھی مجھے نہیں آتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں آج اس طرح اس حال میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں، کچی عمر کے خواب...... انہی خوابوں کا شکار ہوئی ہوں میں۔''

''اللہ رے غلط فہمیاں......! اب اتنی کچی عمر بھی نہیں ہے تمہاری۔'' سانول نے بے ساختہ کہا تو اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''کیا مطلب ہے تمہارا......؟ میں تمہیں بوڑھی نظر آتی ہوں......؟ انیس سال عمر ہے میری...... بس نہیں بتاؤں گی میں کچھ بھی......!'' اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''سوری بابا......! سوری......! اب کچھ نہیں بولوں گا۔ بس......!'' سانول نے کان پکڑتے ہوئے کہا تو اس کا موڈ کچھ بہتر ہوا۔ چند لمحے خاموش رہی پھر دوبارہ گویا ہوئی۔

''میں نہیں جانتی کہ کس پر کس حد تک اعتبار کرنا چاہیئے......؟ کرنا بھی چاہیئے یا نہیں......؟ تم کون ہو......؟ کس طرح کے آدمی ہو......؟ میرے بارے میں جان کر تمہارا کیا رویہ ہوگا......؟ کیا سلوک کرو گے میرے ساتھ......؟ کچھ بھی نہیں جانتی میں...... پتا نہیں کیوں دل چاہ رہا ہے کہ تمہیں سب کچھ سچ بتا دوں...... آگے جو بھی ہوگا وہ تو ہو کر رہے گا۔ حبا چوہدری نام ہے میرا......'' اس نے ایک لمحے کو توقف کیا پھر دوبارہ گویا ہوئی۔

''چوہدری گروپ آف انڈسٹریز کا نام سنا ہوگا تم نے......؟ اس کے مالک اعجاز چوہدری ہیں اور میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔'' سانول نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ایک لمحے کے لئے حبا نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر جیسے کچھ کھوجنے کی کوشش کی لیکن خاموش جھیل نما آنکھوں میں سکوت ہی سکوت تھا پھر وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''پاپا کا بہت بڑا بزنس ہے اور دنیا کے بہت سے ممالک میں پھیلا ہوا ہے۔کبھی وہ لندن ہوتے ہیں تو کبھی پیرس۔ کبھی سنگا پور تو کبھی بنکاک۔ بچپن ہی میں ماما کا انتقال ہوگیا اور میں تنہا رہ گئی۔ پاپا کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا سو انہوں نے میرے لئے ملازموں کی فوج جمع کر دی لیکن ایک باپ مہیا نہ کر سکے۔

ظاہر ہے ان کی بھی مجبوری تھی۔ اتنا بڑا بزنس تھا اگر اس کی دیکھ بھال وہ خود نہ کرتے تو کون کرتا؟

سو میں نے بھی ان سے کبھی شکایت نہیں کی اور اپنے آپ کو حالات کے مطابق ڈھال لیا۔اسکول لائف، کالج لائف تو بہت سی دلچسپیوں کی حامل تھی سو میں نے ہمیشہ خود کو مصروف رکھا لیکن گریجویشن کے بعد میری طبیعت اچاٹ ہوگئی اور میں نے تعلیم کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پاپا نے بہت کوشش کی کہ میں ماسٹر ڈگری حاصل کرلوں وہ مجھے فارن بھیجنے پر رضامند تھے لیکن میں نے ان کی ایک نہیں سنی۔

ناچار وہ تھک ہار کر ایک بزنس ڈیل کی خاطر دوبئی روانہ ہوگئے۔ کچھ دن تک تو سب ٹھیک رہا لیکن پھر میں گھر کے لگے بندھے معمول سے بھی بے زار ہوگئی۔ میں نے اپنے لئے نئی دلچسپیاں تلاش کرنا شروع کر دیں۔ کتابیں، موبائل، انٹرنیٹ...... اور پھر مجھے رحمٰن سمیر ملا، فیس بک پر۔ پہلے چیٹ ہوتی رہی بہت دنوں تک...... پھر موبائل پر رابطہ کیا۔ بہت اچھی گفتگو کرتا تھا وہ اور یوں رفتہ رفتہ میں اس کی عادی ہوتی چلی گئی۔ اتنا کہ اگر کسی دن اس سے میری بات نہ ہوتی تو میں سخت بے چین ہو جاتی۔ مجھے یوں لگتا کہ میں کہیں پر کچھ رکھ کر بھول گئی ہوں یا میری کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی ہے۔

عجیب سی فیلنگز ہوتی تھیں میری...... پھر سمیر نے مجھے بتایا کہ اس بیماری کو محبت کہتے ہیں تو مجھے لگا کہ ہاں سچ ہی تو ہے مجھے شاید اس سے محبت ہوگئی ہے۔

پھر ہمارا ملنے کا پروگرام بننا شروع ہوا۔ سمیر چاہتا تھا کہ ہم فیس ٹو فیس ملاقات کریں لیکن میں چاہتی تھی کہ ہم ہمیشہ کے لئے ایک ہوجائیں سو میں نے پاپا سے بات کی پاپا نے تحمل سے میری بات سنی، میں نے نیٹ پر سمیر کی تصویر بھی انہیں دکھائی تب پاپا نے پوچھا۔

''کرتا کیا ہے یہ لڑکا......؟'' اور میں نے سچ بولا میں نے انہیں بتا دیا۔

''پاپا......!سمیر گریجویٹ ہے۔لیکن فی الحال جاب لیس ہے۔''

میری بات سن کر پاپا طیش میں آ گئے وہ بولے۔

''بیٹا......! آپ کروڑوں روپے کی جائیداد کی مالک ہو، چوہدری گروپ آف انڈسٹریز کا ایک نام ہے۔ پوری دنیا میں اور آپ چاہتی ہیں کہ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک سڑک چھاپ بھیک منگے کے ہاتھ دے دوں......؟ تب سانول...... تب مجھے لگا کہ میرے پاپا میرے ساتھ زیادتی کر رہے ہیں۔ وہ انسانیت کی تذلیل تھی سانول......! امیری، غریبی، وہی دقیانوسی اور گھسی پٹی فلمی سچویشن اونہہ مائی فٹ......!''

اس نے غصے سے گردن جھٹکتے ہوئے ایک نظر سانول کی طرف دیکھا لیکن جب وہ خاموشی سے ہمہ تن گوش رہا تو وہ سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولی۔

''میں نے پوری زندگی کچھ بھی تو نہیں مانگا تھا پاپا سے......؟ زندگی میں پہلی بار کچھ مانگا تھا اور وہ بھی اس لئے کہ یہ میری اپنی زندگی تھی اور پاپا...... پاپا نے مجھے جواب دے دیا۔

''سانول......! انہوں نے انکار کر دیا۔ تب پہلی بار میرے دل نے اس گھر سے، اس ماحول سے اور اپنے پاپا سے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ لیکن میں بے وقوف نہیں تھی، میں نے دل کی آواز لبوں تک نہیں پہنچنے دی بلکہ ڈپلومیسی سے کام لیا۔ میں نے کہا۔

''پاپا......! آپ کے علاوہ میرا اور ہے ہی کون......؟ یہ باتیں آپ نہیں سوچیں گے تو اور کون سوچے گا......؟ میرے دل میں جو کچھ تھا آپ کو بتا دیا لیکن فیصلے کا حق تو آپ ہی کے پاس ہے نا......؟'' اور پاپا کھل اٹھے انہوں نے میرے گال تھپتھپائے اور بولے۔

''آئی ایم پراؤڈ آف یو مائی چائلڈ......! ماں باپ کبھی اولاد کا برا نہیں سوچتے۔ تم دیکھنا میں اپنی بیٹی کی شادی بہت اچھی جگہ کروں گا، بہت ہی اچھی جگہ......''

اور پھر دو تین دن کے بعد پاپا اس بات کو سرے سے بھول گئے۔ وہ نیو یارک چلے گئے تھے۔ میں نے سب کچھ سمیر کو بتا دیا اور ساتھ ہی اپنا فیصلہ بھی۔ اس دن پہلی مرتبہ میں نے سمیر کو یہ بھی بتایا کہ میں چوہدری گروپ آف انڈسٹریز کے مالک اعجاز چوہدری کی بیٹی ہوں اور یہ کہ مجھے پاپا کی دولت سے کوئی دلچسپی نہیں۔سمیر نے مجھے کافی سمجھایا اور کہا کہ جذباتی مت بنو۔ فی الحال ہم ویسے ہی ملاقات کرتے ہیں،کوئی راستہ نکال ہی لیں گے۔لیکن میں اپنے فیصلے پر اڑی رہی۔

مجھے پاپا کے کروڑوں،اربوں روپے سے واقعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مجھے تو بس سمیر چاہئے تھا لیکن اب میں اتنی بھی جذباتی نہیں تھی کہ مستقبل کی طرف سے بالکل ہی لاپرواہ ہو جاتی۔ میرے اکاؤنٹ میں تقریباً دس لاکھ روپے موجود تھے۔ میری گولڈ اور ڈائمنڈ کی جیولری بھی تقریباً بیس تیس لاکھ روپے کی تھی ہی۔ میں نے رقم نکلوائی، جیولری اکٹھی کی، سب کچھ بریف کیس میں رکھا اور گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔

ہاں ٹرین میں بیٹھنے سے پہلے میں نے سمیر کو کال کر کے ٹرین کا نام ضرور بتا دیا تھا۔ اس کے بعد میں نے راستے میں بار بار ٹرائی کی لیکن سمیر کا نمبر مسلسل آف تھا۔ وعدے کے مطابق وہ اسٹیشن پر بھی نہیں آیا۔ صبح سے شام تک میں نے اس کا انتظار کیا لیکن اس نے نہ آنا تھا اور نہ آیا اور اتنی سمجھ تو مجھے بھی آ ہی گئی تھی کہ اب اس کا نمبر دوبارہ کبھی ایکٹو نہیں ہوگا۔

پھر تم مل گئے سانول......! اور...... اور اب میں تمہارے سامنے بیٹھی ہوں۔ سمیر تو نہیں آیا سانول......! لیکن میں...... میں اب واپس نہیں جا سکتی......؟''

اور سانول دم بخود بیٹھا رہ گیا۔ یہ داستان الف لیلیٰ اسے ابھی تک اپنے سحر میں لئے ہوئے تھی۔ حبا چند لمحے بیٹھی اس کی طرف دیکھتی رہی پھر اس نے پلنگ کے نیچے سے اپنا بریف کیس گھسیٹا اور کھول کر سانول کے سامنے رکھ دیا۔ سانول نے حیرت سے اس کی یہ حرکت دیکھی پھر ایک نظر بریف کیس پر ڈالی جس

میں نوٹوں کی گڈیاں چنی ہوئی تھیں اور ساتھ ہی جیولری کے باکس بھی ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔

''یہ رقم تمہیں نئی زندگی شروع کرنے کے لئے کافی ہوگی سانول......! بس مجھے تمہارا سہارا چاہئے اور...... اور کچھ بھی نہیں۔'' حبا نے کہا۔

سانول نے نظریں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا اور پھر ہاتھ بڑھا کر بریف کیس بند کرتے ہوئے بولا۔

''مجھے فی الحال صرف تمہارا موبائل چاہئے۔مل سکے گا......؟'' اور حبا نے موبائل اس کی جانب بڑھا دیا۔

''اب تم بے فکر ہو کر لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔میں کچھ دیر تک آتا ہوں اور ہاں......! پریشانی کی بات نہیں......میں باہر برآمدے میں چٹائی ڈال کر سو جاؤں گا۔تم آرام سے پلنگ پر لیٹو اور سو جاؤ......!'' سانول نے جملہ مکمل کیا اور گھر سے باہر نکل آیا۔حبا نے آرام سے پلنگ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔آسودگی کا احساس تھا۔گھر سے کافی فاصلے پر آنے کے بعد سانول نے ایک نمبر پش کیا اور موبائل کان سے لگا لیا کچھ ہی دیر کے بعد کال ریسیو کر لی گئی تو سانول نے کہا۔

''ہیلو فاروق......! کیسے ہو......؟ سانول بات کر رہا ہوں۔'' پھر رسمی گفتگو کے بعد سانول نے تمام ماجرا اسے کہہ سنایا۔

''ابے تیری تو لاٹری نکل پڑی باس......! تو سچ کہہ رہا ہے......؟'' دوسری جانب سے فاروق کی پرُجوش آواز سنائی دی۔تو سانول بولا۔

''یار......! میں سخت پریشان ہوں اور تم خوش ہو رہے ہو......؟ بے وقوف......! وہ کسی معمولی آدمی کی بیٹی نہیں، چوہدری گروپ آف انڈسٹریز کے مالک اعجاز چوہدری کی اکلوتی بیٹی ہے وہ...... اور میں ٹھہرا ایک غریب اور بے روزگار آدمی...... مجھے تو لگتا ہے کہ وہ لڑکا بھی اسی خوف سے روپوش ہوگیا ہے۔ اوپر سے چالیس پچاس لاکھ وہ بریف کیس میں لئے گھوم رہی ہے۔ میں تو بے

موت مارا جاؤں گا نا......؟''

''تو بھی ڈھکن ہے یار......! تو خود تو اسے بھگا نہیں لایا نا......؟ انیس سال تم اس کی عمر بتا رہے ہو۔ اس کا مطلب ہے وہ بالغ بھی ہے۔ پھر ڈر کا ہے کا......؟ خیر اب تو جا کے سو جا، میں صبح آؤں گا۔ دو چار دن رکتا ہوں تیرے یہاں۔ اپنے دوست کی حیثیت سے تعارف کرا دینا میرا۔ کوئی حل نکال لیں گے۔ پریشان نہ ہو۔'' فاروق نے اسے تسلی دی اور لائن ڈس کنکٹ کر دی۔ پھر وہ مرے مرے قدموں سے گھر کی طرف واپس چل دیا۔

''میں تو خود مرنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ موت اور زندگی کے درمیان تھوڑا ہی فاصلہ رہ گیا تھا۔ جب قدرت نے اسے بھیج دیا۔ اس نے تو میری جان بچائی ہے اور کیا پتا قدرت اسی طرح میرے حالات بدلنا چاہتی ہو۔ پھر میں اتنا خوفزدہ کیوں ہو گیا......؟ کیوں اتنا پریشان ہوں، اس نے سوچا اور پھر جیسے وہ اس کی رضا پر راضی ہو گیا۔ اب اس کے دل میں سکون ہی سکون لہریں لے رہا تھا۔ اور اس کے قدموں کی رفتار بھی جیسے خود ہی تیز ہو گئی تھی۔

☆☆☆

حبا نے حفظ کلاس میں داخلہ لے لیا تھا۔ شام کی گنتی تک تو تب تک تو بات ٹھیک تھی لیکن صبح کو ہونے والی گنتی صبح کی اذان کے فوراً بعد ہوتی تھی اور انہیں خواب خرگوش کے مزے لوٹنے کی بجائے قطار در قطار باہر نکل کر کھڑا ہونا پڑتا۔ ایک دو دن تو پرابلم ہوئی تھی لیکن پھر اس نے خود کو اس نئے ماحول کے ساتھ ایڈجسٹ کر لیا تھا۔ جو لڑکیاں یا خواتین خود اٹھ جاتی تھیں وہ تو ٹھیک رہتیں لیکن جو سو رہی ہوتیں۔ ان کے ٹخنوں کو کشور کی چھڑی کی ضرب برداشت کرنا پڑتی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ جاتیں۔ جیل میں نوری اس کی بہترین گائیڈ ثابت ہو رہی تھی۔ پہلے ہی دن سے اذانوں کے وقت وہی اسے جگاتی تھی اور وہ لیڈی کانسٹیبل کشور کی چھڑی کی ضرب سے محفوظ رہتی۔ گنتی ہوتی پھر اس کے بعد سب نماز پڑھتیں جس

کے بعد سب ناشتے کے چکر میں لگ جاتیں۔

جیل کا کھانا عجیب وغریب ہوتا تھا دال وغیرہ ہوتی تھی لیکن اس میں دال نام ہی کی ہوتی تھی یوں لگتا جیسے پانی کے اندر آٹا ڈال کر روکھا پھیکا پیسٹ سا تیار کر دیا گیا جس میں نمک ہوتا اور نہ مرچ لقمہ منہ میں رکھو تو ابکائی آنے لگے۔ ہفتے میں ایک دن یعنی جمعرات کو گوشت بھی پکتا تھا لیکن بوٹی پیالی میں ڈبکی لگا کر بھی تلاش نہیں کی جا سکتی تھی۔ روٹی آدھی کچی آدھی پکی۔ غرض کھانے میں کچھ بھی کھانے لائق ہرگز نہیں ہوتا تھا لیکن جن کی مجبوری تھی وہ پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے یہ سب زہر مار کرنے پر مجبور تھیں۔

البتہ کچھ عورتیں یہاں بھی خوش حال تھیں اور یہ وہ عورتیں تھی جن کی ہفتے میں ایک یا دو مرتبہ ملاقات آتی تھی۔ جن کی فیملی کے لوگ ان سے ملنے آتے تھے وہ ہر ملاقات پر دودھ کے ڈبے، فروٹ، خشک راشن جیسے دالیں، چاول، گھی، چینی وغیرہ دے جایا کرتے تھے اور جن کا راشن آتا تھا وہ کم از کم کھانے پینے کی حد تک تو یہاں مزے میں تھیں۔ وہ اپنا کھانا خود بناتی تھیں اور اس مقصد کے لئے ان کے پاس یہاں انگیٹھیاں موجود تھیں اور وہ بھی اپنی نوعیت کی منفرد...... پانچ کلو والے گھی کے ڈبے کے اندر مٹی لگا کر وہ انگیٹھی جیل ہی میں تیار کی جاتی جس میں کوئلے جلائے جاتے تھے اور یہ کوئلے بھی راشن کے ساتھ باہر ہی سے آتے تھے۔

پیاز یا سبزی وغیرہ کاٹنے کے لئے اسٹیل کے چمچے سے تیار کیا گیا مخصوص انداز کا خود ساختہ کٹ استعمال کیا جاتا تھا۔ کیونکہ بلیڈ، چھری یا چاقو وغیرہ جیل میں لانے یا رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ کٹ بھی چوری چھپے ہی رکھا جاتا تھا۔ لیکن جن کے پاس رقم ہوتی تھی وہ جیل کے اندر بھی سب چیزیں کھلے عام رکھ سکتی تھیں۔ پیسہ ہی وہ طاقت تھی جو جیل کے باہر اور جیل کے اندر ہر طرح کی سہولت مہیا کرتا تھا۔

جیل کی انتظامیہ مال دار خواتین پر خصوصی طور پر مہربان رہی تھی کچھ خواتین

ڈرگز کی عادی تھیں اور وہ انہیں جیل کے اندر ہی دستیاب ہوتی اور پھر اس نے دوچار ایسی خواتین بھی دیکھ لیں جو ایسی چیزیں دھڑلے سے فروخت کرتی تھیں اور جیل انتظامیہ کی آشیرباد کے بغیر تو ظاہر ہے کہ ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔

غرض یہ کہ عقل کو حیران کر دینے والے ایسے بہت سے مناظر اس نے یہاں دیکھے جو جیلوں کے حوالے سے کسی کے تصور میں بھی نہیں آ سکتے۔

جہاں یہ سب کچھ تھا وہاں کچھ مثبت باتیں بھی تھیں اور وہ یہ کہ یہاں رہتے ہوئے اگر کوئی پڑھنا چاہے تو اس کا باقاعدہ انتظام تھا، کتابیں مہیا کی جاتیں، ٹیچرز بھی آتی تھیں۔ اسی طرح دینی تعلیمات کا سلسلہ بھی تھا۔

سو اس نے حفظ کلاس میں داخلہ لے لیا تھا جو صبح سات بجے سے لے کر گیارہ بجے تک جاری رہتی۔ کلاس سے فارغ ہو کر نوری اور حبا بیرک میں داخل ہوئی ہی تھیں کہ ملاقات کا پرچہ لئے ایک لیڈی کانسٹیبل وہاں داخل ہوئی۔ یہ معمول کی بات تھی، جس کی ملاقات آتی تھی ان کے ناموں کی باقاعدہ ایک لسٹ بنتی تھی اور پھر ایک کانسٹیبل وہ پرچہ اٹھائے تمام بیرکوں کا چکر لگاتی اور ان خواتین کے نام پکارتی جن کی ملاقات آئی ہوتی اور یوں وہ خواتین ملاقات کے شیڈ کی طرف چلی جاتیں۔

پچھلے ڈیڑھ مہینے سے اسے ایسی تمام باتوں سے کافی حد تک واقفیت ہوگئی تھی۔ کانسٹیبل نے وہاں کھڑے ہو کر نام پکارنا شروع کئے اور پھر تیسرے نمبر پر بولی۔

''حبا ولد اعجاز چوہدری......!'' اور وہ حیران رہ گئی۔ پچھلے ڈیڑھ مہینے کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا۔

''کون ہوسکتا ہے......؟'' اس نے حیرت سے سوچا اور پھر ایک صورت اس کے پردہ ذہن پر نمودار ہوئی۔

''سانول......!'' ایک سرسراتی ہوئی سی سرگوشی اس کے لبوں سے آزاد ہوئی

اور پھر وہ بے چینی سے باہر لپکی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ملاقات والے شیڈ کے قریب کھڑی تھی جس کا دروازہ بند تھا اور دروازے کے باہر ایک مسلح لیڈی کانسٹیبل موجود تھی۔

تقریباً بیس منٹ کے بعد شیڈ کا دروازہ کھلا اور اس میں سے خواتین برآمد ہونا شروع ہوئی اور پھر ان لوگوں کی باری آئی۔ بہت سی دوسری خواتین کے ساتھ وہ بھی اپنے دھڑکتے دل کے ساتھ شیڈ میں داخل ہوگئی اور جالی کے پار سانول کی صورت تلاش کرنے لگی۔ لیکن جو صورت اسے وہاں نظر آئی اسے دیکھ کر وہ دھک سے رہ گئی اور اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ اس نے لڑکھڑا کر جالی کو تھام لیا اور پھر کپکپاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''پپ...... پاپا...... آپ......؟'' اور وہ دھیرے دھیرے چلتے ہوئے اس کے عین سامنے آرکے۔ سرخ و سپید رنگت اونچا لمبا قد، کنپٹیوں پر سفید بال، سرمئی کلر کے ٹوپیس سوٹ میں ملبوس وہ ایک بارعب پرسنالٹی نظر آرہے تھے۔

''کیوں...... کیا ایسا تم نے......؟'' ان کے لبوں سے جیسے کوئی نوحہ بلند ہوا اور حبا لڑکھڑا کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

''پاپا......! آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ سڑک چھاپ آپ کی بیٹی کے لائق نہیں تھا۔ لیکن سچ کہوں تو میں بھی آپ کی بیٹی ہونے کے لائق نہیں تھی اس لئے...... اس لئے پاپا......! میں نے آپ کو دوبارہ اپنی شکل نہیں دکھائی اور پھر میں...... میں آپ کو اپنی شکل دکھانے کے لائق بھی تو نہیں تھی۔'' وہ رو دی اور اعجاز چوہدری پتھر کا بت بنے وہیں کھڑے یک ٹک اسے دیکھے جارہے تھے۔

''پاپا......! ایک مرتبہ تو میں غلطی کرچکی تھی، دوسری غلطی نہیں کرسکتی تھی اس لئے پاپا......! اس لئے میں نے سانول کا انتخاب کرلیا اور سانول ویسا نہیں ہے پاپا......! وہ بہت اچھا ہے۔ سچا، سیدھا، صاف گو اور کھرا انسان...... لیکن میں جانتی تھی پاپا......! کہ آپ کے معیار پر وہ بھی پورا نہیں اترے گا۔ آپ کے پاس ہر

انسان کو تولنے کے لئے صرف دولت کا ترازو ہے اور وہ تو غریب آدمی تھا۔ اتنا کہ تین دن سے اس نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ میں نے اسے کھانا کھلایا اور سوچا کہ اب وہ کبھی بھوکا نہیں رہے گا اور پتا ہے پاپا......! وہ مرنے جا رہا تھا۔ میں نے اسے زندگی دے دی یوں کہ اپنی زندگی اس کے نام کر دی۔

اب اس کی زندگی اس کی نہیں رہی تھی، وہ میری زندگی تھی اور وہ زندگی کوئی نہیں چھین سکتا تھا......کوئی بھی نہیں......! بس پاپا......! آپ اتنا سمجھ لیں کہ سانول اب حبا چوہدری کی زندگی جی رہا ہے اور میں سانول کی......! آپ......آپ سمجھ ہی نہیں سکتے پاپا......! آپ تو کبھی یہ بھی نہیں سمجھ پائے کہ آپ کی ایک بیٹی بھی ہے جسے آپ کی ضرورت ہے......آپ میری ضرورتوں کو کیا سمجھیں گے پاپا......!''

وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں بولی اور اعجاز چوہدری ایک جھٹکے سے مڑے اور پھر شیڈ سے باہر نکل گئے۔ انہوں نے جیب سے رومال نکالا اور پھر بے اختیار چھلک آنے والے وہ دو آنسو ان کے رومال میں جذب ہو گئے۔ انہوں نے وہ آنسو حبا سے چھپا لئے تھے۔

☆☆☆

''فاروق ملک......! میرا بہت اچھا دوست ہے یہ۔'' سانول نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو حبا نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ پستہ قد اور لمبوترے چہرے کا مالک، پتلی پتلی باریک مونچھیں اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں جن میں کوٹ کوٹ کر خباثت ہی خباثت بھری ہوئی نظر آ رہی تھی۔ حبا کو سانول کا وہ دوست ایک آنکھ نہیں بھایا تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں کو دیکھ کر سانپ کی آنکھوں کا سا تصور ابھرتا تھا ذہن میں اور اس نے بے اختیار گھبرا کر نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

''جی......خوشی ہوئی یہ جان کر اور ان سے مل کر۔'' پھر وہ دونوں برآمدے میں جا کر چٹائی پر بیٹھ گئے اور آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ جبکہ وہ عجیب سی بے

بےچینی اور گھبراہٹ کا شکار ہوگئی۔ نہ جانے کیوں اس کی چھٹی حس چیخ چیخ کر یہ اعلان کرنے لگی کہ کچھ ہونے والا ہے۔ کچھ ایسا جو سمجھ میں نہ آتا ہو۔ کچھ ایسا جو انوکھا خطرناک ہو۔ لیکن کیا......؟ اس بات کا جواب اسے کون دیتا......؟ وہ پلنگ پر سے اٹھی اور پھر کمرے کا بیرونی دروازہ بھیڑتے ہوئے واپس پلنگ پر آبیٹھی۔ پتا نہیں کیوں وہ فاروق کی طرف سے کھٹک چکی تھی اور اب پوری طرح چوکنی تھی۔

کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔ آنے والا سانول تھا۔

''فاروق ملتان سے آیا ہے۔ دو تین دن ادھر ہی رکے گا۔ اگر تم محسوس نہ کرو تو چائے بنا دو اور بسکٹ وغیرہ تو ہیں ہی۔ میں بازار سے کھانا لے کر ابھی آتا ہوں۔'' اور وہ بادل ناخواستہ سر ہلا کر رہ گئی۔

سانول چلا گیا تو وہ اٹھ کر کچن میں داخل ہوگئی۔ کچن میں داخل ہونے کے لئے اسے فاروق کے پاس سے گزرتے ہوئے صحن میں جانا پڑا لیکن وہ نظریں جھکائے چٹائی پر بیٹھا رہا۔ حبا نے چائے بنائی، بسکٹ کا پیکٹ کھول کر پلیٹ میں سجایا اور پھر پلیٹ اور کپ ٹرے میں رکھنے کے بعد ٹرے اٹھائے برآمدے میں داخل ہوگئی۔ لیکن یہ کیا...... فاروق تو وہاں تھا ہی نہیں......!

''ابھی تو یہیں تھا...... کہاں گیا ہوگا......؟ شاید واش روم میں گیا ہو لیکن واش روم تو کچن سے بھی آگے صحن کے آخری کونے میں تھا۔ اگر واش روم جاتا تو اسے کچن کے سامنے سے گزرنا پڑتا لیکن اس نے تو اسے وہاں سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا...... پھر......؟ شاید وہ اپنی ہی سوچوں میں مگن تھی اس نے خیال نہیں کیا ہوگا۔'' حبا نے کھڑے کھڑے سوچا۔ پھر شانے اچکاتے ہوئے ٹرے چٹائی پر رکھی اور کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ لیکن کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ ھک سے رہ گئی۔ فاروق اس کے پلنگ کے پاس زمین پر بیٹھا تھا اور اب دروازہ کھول کر اس کے اندر داخل ہونے کی آہٹ پر چونک کر اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

''وہ......پچ...... چوہا تھا......اتنا موٹا تازہ چوہا...... میرے سامنے سے

بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو میں نے سوچا کہ مار دینا چاہئے...... لیکن ملا نہیں کمبخت......!'' اس نے بریف کیس پلنگ کے نیچے دھکیلتے ہوئے کھسیانے انداز میں کہا اور پھر ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایسا خوب صورت اور قیمتی بریف کیس سانول کے پاس تو نہیں تھا، آپ کا ہے کیا......؟'' اس نے اپنی کھسیاہٹ پر قابو پاتے ہوئے سوال کیا تو حبا جو خاموش کھڑی ہونٹ کاٹ رہی تھی، جھلائے ہوئے انداز میں بولی۔

''جی......! میرا ہے...... آپ کو کوئی اعتراض ہے کیا......؟''

''نن...... نہیں......! مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے......؟'' اس نے کندھے اچکاتے ہوئے ہکلاہٹ آمیز انداز میں جواب دیا اور پھر تیزی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

حبا نے ایک طویل سانس لی اور پھر پلنگ پر ڈھیر ہوتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ ابھی اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز لٹکائے سانول کمرے میں داخل ہوا تو حبا جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ شاپنگ بیگز ٹیبل پر رکھ کر وہ پلٹا تو حبا اس کے سر پر کھڑی تھی پھر وہ مضبوطی سے اس کا کندھا دباتے ہوئے بولی۔

''سانول......! سانول......! مجھے تمہارے اس دوست سے وحشت ہوتی ہے۔''

''کیوں...... کچھ کہا اس نے......؟'' سانول نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں......! لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس سے خوف آتا ہے۔ پلیز سانول......! جب تم گھر سے باہر نکلو تو اسے بھی ساتھ لے جایا کرو نا...... پلیز......!'' حبا نے عجیب سہمے ہوئے سے انداز میں کہا تو سانول کو وہ ڈری ڈری، سہمی سہمی سی حبا بہت پیاری لگی۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اسے بانہوں میں بھر لے اور کہے کہ میرے ہوتے ہوئے تمہیں گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں حبا......! لیکن وہ

ایسا کچھ بھی نہ کر سکا۔ بس اس کا کندھا تھپکتے ہوئے بولا۔

''اوکے......! اوکے...... ڈونٹ وری......! میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔'' اور پھر دھیرے سے اپنا کندھا چھڑاتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ حبا اس کے اتنا کہہ دینے سے مطمئن ہوگئی تھی لیکن اس کا یہ اطمینان زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہ سکا تھا۔ کیونکہ کھانا کھاتے وقت فاروق کا وہ انداز اسے دوبارہ بے چین کر گیا تھا۔ اس کی نظروں کی چبھن اس نے اپنے پورے وجود پر محسوس کی تھے۔ وہ کھاتے کھاتے بار بار چونک کر اس کی طرف دیکھتی لیکن اس سے نظریں ٹکراتے ہی وہ سر جھکا لیتا۔

کچھ ہی دیر کے بعد اس کی مخصوص نسوانی حس اسے خبردار کرتی تو وہ دوبارہ چونک اٹھتی۔ نگاہوں کا تصادم ہوتے ہی وہ فوراً نظریں جھکا دیتا لیکن وہ اس کی آوارہ نظروں کی گستاخیاں بدستور محسوس کر رہی تھی اس کی طبیعت مکدر ہوگئی اور وہ کھانا بھی صحیح طریقے سے نہ کھا سکی۔ خدا خدا کر کے کھانا ختم ہوا اور وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے لیکن اس کی بے چینی اپنے عروج تک پہنچ چکی تھی۔ کچھ گڑبڑ ضرور تھی لیکن ابھی تک وہ کوئی درست اندازہ قائم کرنے سے قاصر رہی تھی۔

اس کی نظریں اسے ٹٹولتی رہی تھیں لیکن اس کی نظروں کا انداز ویسا نہیں تھا جیسا کسی لڑکی کو دیکھ کر کسی مرد کا ہو سکتا تھا۔ تو پھر کیا تھا کون سا غیر فطری عمل تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا؟ ایسی کیا بات تھی جو اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی؟ آخر وہ کون سا اندیشہ تھا جو اسے مضطرب کیئے ہوئے تھا؟ وہ بہت دیر تک خیالوں کے تانے بانے بنتی اور الجھتی رہی لیکن بے سود......

وہ کسی بھی نتیجے تک نہیں پہنچ سکی تھی۔ اس کا دماغ اسے بار بار ایک ہی تلقین کر رہا تھا۔

''محتاط......! محتاط......!''

اور اس نے دماغ کی اس آواز پر لبیک کہہ دیا۔ وہ تہیہ کر چکی تھی کہ آج کی

رات وہ نہیں سوئے گی اور پھر اس نے ایسا ہی کیا۔ وہ پلنگ پر لیٹ گئی۔ یوں کہ اس کی آنکھیں تو بند تھیں لیکن ذہن کے ساتھ ساتھ اس کی تمام حسیات پوری طرح بے دار تھیں۔ اسے یقین تھا کہ پردہ غیب سے کچھ نہ کچھ ضرور ظہور میں آئے گا۔ اور وہ اپنے وجدان سے آنکھیں نہیں چرا سکتی تھی۔

شاہ خاور کب سے افق کی گود میں لیٹ کر اپنی آنکھیں موند چکا تھا لیکن وہ آنکھیں بند ہوتے ہوئے بھی جاگ رہی تھی۔ ہاں سانول اور فاروق شاید گہری نیند سو چکے تھے کیونکہ ان کی باتیں کرنے کی آواز بہت دیر پہلے بند ہو چکی تھی اور اس وقت پورے گھر میں گہرا سناٹا طاری تھا۔

رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی اور وہ کسی انہونی کی منتظر تھی۔ پھر نہ جانے رات کا وہ کون سا پہر تھا جب اسے ایک ہلکے سے کھٹکے کی آواز سنائی دی۔ وہ بجلی کی سی پھرتی سے اٹھی اور پھر بلی کی طرح دبے پاؤں چلتی ہوئی دروازے تک جا پہنچی۔ اگلے ہی لمحے وہ دروازے کی ایک درز پر جھکی باہر دیکھ رہی تھی اور پھر وہ اس کی نظروں میں آ گیا۔ ساٹھ واٹ کے بلب کی زردی مائل روشنی میں وہ اسے بخوبی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ ارد گرد دیکھتے ہوئے چوروں کی طرح صحن کی طرف بڑھ رہا تھا اور اس کا یہ انداز حبا کے شک کو یقین میں بدلنے کے لئے کافی تھا۔

''گڑ بڑ تو ہے۔'' اس نے سوچا، جب وہ برآمدے کے باہر نکل کر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ بے چین ہو گئی۔

''کیا کروں......؟' اس نے خود سے سوال کیا اور پھر شاید وہ فیصلے پر پہنچ گئی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی نظریں سانول کے چہرے سے الجھیں لیکن وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا دکھائی دیا۔ پھر دوسرے ہی لمحے وہ برآمدے سے نکل کر صحن میں تھی۔ لیکن وہ کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ دبے قدموں بیرونی دروازے کی طرف بڑھی لیکن پھر واش روم سے پانی گرنے کی آواز سن کر اس کے اندر موجود مادہ جیمز بانڈ کی روح تک بلبلا اٹھی۔

''دھت تیرے کی......! یہ گڑبڑ ایسی تو نہیں تھی جو کسی بھی اعتبار سے قابل گرفت ہوتی۔'' اس نے مایوسی سے سوچا پھر وہ واپس پلٹنے ہی والی تھی کہ سنائی دینے والی آواز کو سن کر وہ یک لخت دیوار سے جا چپکی۔ یہ آواز پانی گرنے کی نہیں بلکہ انسانی آواز تھی۔ جو فاروق ملک کے علاوہ اور کسی کی نہ تھی۔

''دیکھو صغیر......! دوستی گئی تیل لینے، یہ روکڑے کا معاملہ ہے اور تیرے پانچ لاکھ تو پکے ہیں۔ ملتان آکر لے لینا۔ نہیں نہیں...... کل ہر صورت نکل جاؤں گا...... پرسوں آکر وصول کر لینا۔ اب اتنا اعتبار تو تمہیں بھی کرنا ہی پڑے گا۔'' پھر کچھ لمحے کے توقف کے بعد آواز دوبارہ سنائی دی۔

''نہیں میں رسک نہیں لے سکتا۔ دونوں کو ٹپکانا پڑے گا۔ بس تم صبح ہوتے ہی دروازہ بجاؤ اور بوتل دے کر چلتے بنو۔ بس خیال رکھنا کہ زہر سریع الاثر ہو اور دو بندوں کو لڑھکا سکے...... سمجھے......؟'' اور حبا کے دماغ میں سناٹے اتر آئے۔ اس کے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ پردہ ہٹ چکا تھا۔ وہ لاشعور میں ڈنک مارنے والے بچھو کا پس منظر جان چکی تھی۔

ساری حقیقت کھل کر اس کے سامنے آچکی تھی۔ اب وہ اچھی طرح جان چکی تھی کہ وہ کون سی بات کون سا خدشہ تھا جو اسے بے چین کر رہا تھا۔ اس نے اپنے اعصاب پر قابو پانے کی کامیاب کوشش کی اور جلد ہی وہ سنبھل چکی تھی۔ پھر وہ تیزی سے لیکن دبے قدموں برآمدے کی طرف لپکی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ بند کرنے کے بعد پلنگ پر لیٹی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی۔

''تو یہ تھا فاروق ملک کا اصلی روپ......؟ یہ ہے سانول کا قریبی اور گہرا دوست......؟'' اس نے تلخی سے سوچا۔

''سانول کو نئی زندگی میں نے دی ہے۔ وہ تو اسی دن مرنے جا رہا تھا۔ اب یہ زندگی اس کی نہیں، یہ زندگی میری امانت ہے اور یہ زندگی کوئی نہیں چھین سکتا۔

کوئی بھی نہیں......!'' اس نے جیسے خود کلامی کے انداز میں بڑبڑاتے ہوئے کہا اور پھر پتا نہیں کس وقت وہ گہری نیند سوگئی۔ صبح آنکھ کھلی تو جو پہلی آواز سنائی دی وہ فاروق کی ہی منحوس آواز تھی۔

''تم لے آؤ نا یار......!جا کر...... میں صبح ہی صبح کیا کروں گا جا کر......؟'' پھر سانول کی جوابی آواز سنائی دی۔

''جب سے آئے ہو عورتوں کی طرح گھر میں ہی گھسے بیٹھے ہو...... ذرا باہر کی تازہ ہوا کا نظارہ بھی لو...... اٹھ جاؤ جلدی سے...... ناشتہ لینے تم میرے ساتھ جاؤ گے بس میں نے کہہ دیا۔'' اور وہ جھوم اٹھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ اسے کیوں ساتھ لے جا رہا تھا۔ صرف اس لئے کہ یہ اسے حبا نے کہا تھا۔ اور یہ جان کر حبا کی روح تک سرشار ہوگئی کہ سانول کو اس کی کہی ہوئی بات کی پرواہ تھی۔

اس لمحے اسے سانول پر بہت پیار آیا۔ وہ انگڑائی لے کر بستر سے اٹھی اور پھر اس نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سانول بولا۔

''ہم ناشتہ لینے جا رہے ہیں حبا......! تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں۔'' یہ کہہ کر سانول صحن کی طرف مڑ گیا جب کہ فاروق بھی برے برے منہ بناتا اس کے پیچھے تھا۔

ان کو گئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی۔ حبا نے دروازہ کھولا تو سامنے ایک چیچک زدہ چہرے والا آدمی دکھائی دیا۔

''وہ جی...... فاروق صاحب سے ملنا تھا۔''

''وہ تو گھر پر نہیں ہیں، کہیں باہر گئے ہیں۔ کوئی پیغام ہو تو بتا دیں۔'' نووارد چند لمحوں تک تو جیسے تذبذب کا شکار رہا پھر جیب میں ہاتھ ڈال کر آئی ڈراپس نما ایک چھوٹی سی بوتل نکالی اور اس کے ہاتھ میں تھما دی جس کے لیبل پر لکھا تھا۔

''خالص عرق گلاب......!''

''وہ جی...... میری ادھر حکمت کی دکان ہے۔ فاروق صاحب جب بھی ادھر

آتے ہیں آنکھوں کے لئے گلاب کا خالص عرق مجھ سے ہی لے کر جاتے ہیں۔ وہ جیسے ہی گھر آئیں آپ یہ بوتل یاد سے انہیں دے دیں۔'' پھر وہ سلام کر کے واپس چلا گیا اور حبا کی رگوں میں دوڑنے والا خون اس کی کنپٹیوں میں جیسے ٹھوکریں مارنے لگا۔

وہ سنسناتے ذہن کے ساتھ کچن میں داخل ہوئی اور پھر متلاشی نظروں سے ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ جلد ہی اسے آئی ڈراپس کی وہ چھوٹی بوتل نظر آگئی جو اس سے پہلے بھی وہ یہاں دیکھ چکی تھی۔ پھر وہ فوراً اپنی کارروائی میں مصروف ہوگئی۔

چند ہی لمحوں کے بعد آئی ڈراپس کی خالی بوتل میں ''خالص عرق گلاب'' منتقل ہو چکا تھا۔ اس نے آئی ڈراپس کی بوتل اپنے لباس میں چھپائی اور عرق گلاب والی بوتل میں پانی بھر کر اسے ڈھکن لگا دیا۔ پھر کمرے میں داخل ہو کر پانی بھری عرق گلاب کی بوتل ٹیبل پر رکھنے کے بعد وہ پلنگ پر ڈھیر ہوگئی۔

ناشتہ کرتے وقت بھی وہ بوتل ٹیبل پر موجود تھی لیکن کسی نے بھی اس پر خصوصی توجہ نہ دی۔ یہاں تک کہ فاروق نے بھی نہیں۔ وہ کچھ مضطرب سا دکھائی دے رہا تھا اور بار بار پہلو بدل رہا تھا۔ رات کی مانند حبا بھی اس کی نگاہوں کی ہدف نہیں تھی۔ حبا نے کھنکار کر جیسے گلا صاف کیا پھر بولی۔

''فاروق صاحب...... ! ایک آدمی آیا تھا اور آپ کے لئے عرق گلاب کے یہ ڈراپس دے گیا ہے۔'' فاروق نے ایک نظر اس چھوٹی سی بوتل کی طرف دیکھا اور پھر جھپٹ کر اسے اٹھا لیا۔ سانول نے سرسری سے انداز میں اس کی یہ حرکت دیکھی اور دوبارہ ناشتہ کرنے میں مشغول ہوگیا۔

''اوہ ہاں...... ! یہاں میرے ایک دو اور دوست بھی ہیں جیسے کہ یہ حکیم صاحب، جب بھی یہاں آتا ہوں عرق گلاب کا تحفہ ضرور دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس کے استعمال سے آنکھیں ہمیشہ ٹھیک رہتی ہیں۔ ایسا ہی ایک ہوٹل والا دوست بھی ہے۔ بہت اچھا کھانا ہوتا ہے ان کا، آج دوپہر کو کھانا میں لاؤں گا اور

وہیں سے لاؤں گا۔'' فاروق نے فوراً ہی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ اگلی چال بھی چل ڈالی۔لیکن اب صورت حال مختلف تھی کیونکہ دوسرا کھلاڑی اس کے کھیل کے انداز سے واقف ہو چکا تھا۔

''جی نہیں......!آج دوپہر کا کھانا میں خود اپنے ہاتھ سے تیار کروں گی۔میں نے کوکنگ کا کورس کس لئے کیا ہے بھلا......؟ آپ رات کو کھانا لے آیئے گا اپنے دوست کے ہوٹل سے۔''حبا نے بھی فوراً ہی اس کی چال کا توڑ کرتے ہوئے جواب دیا تو فاروق کسمسا کر رہ گیا۔ پھر جیسے بے چارگی سے بولا۔

''چلو جیسے آپ کا حکم......!دوپہر کا نہ سہی رات کا سہی۔'' پھر حبا نے واقعی بڑے اہتمام سے دوپہر کا کھانا تیار کیا اور یہی نہیں وہ ڈشیں اٹھا اٹھا کر فاروق کے سامنے بھی رکھتی رہی۔

''یہ وائٹ کڑاہی لیں نا......؟اور یہ کڑھی پکوڑے......یہ تو میں نے خاص آپ کے لئے بنایا ہے۔ارے سویٹ ڈش تو آپ نے لی ہی نہیں......! یہ بھی چکھیں نا......؟ کھانا کھا لیا گیا پھر فاروق ہی بولا۔

''بھئی مان گئے حبا جی......! کھانا تو آپ نے واقعی مزے کا بنایا ہے۔ضرورت سے زیادہ کھایا اور ڈٹ کر کھا لیا۔''

''زندگی کا آخری کھانا انسان کو ڈٹ کر کھانا چاہیئے تاکہ مرتے وقت حسرت نہ ہو کہ کھایا کچھ نہیں۔'' حبا نے زہر خند انداز میں کہا تو سانول نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کک...... کیا مطلب......؟'' فاروق نے ہکلاتے ہوئے پوچھا تو حبا اپنے لباس میں سے آئی ڈراپس کی چھوٹی سے بوتل نکالتے ہوئے بولی۔

''مطلب یہ مسٹر فاروق ملک......! کہ آپ کا ''عرق گلاب'' میں نے اس بوتل میں منتقل کر دیا تھا جو اب آپ کے معدے میں منتقل ہو چکا ہے۔'' اور فاروق کی پیشانی پر انتہائی تیز رفتاری سے پسینے کی بوندیں نمودار ہونے لگیں۔

''اور آپ کی جیب میں موجود بوتل میں صرف پانی ہے...... سادہ پانی۔''
حبا نے گرتی ہوئی دیوار کو ایک آخری دھکا دیا اور فاروق اس کے لفظوں کا یہ وار نہ سہہ سکا۔ وہ الٹ کر زمین پر جا گرا اور بری طرح تڑپنے لگا۔ پھر اس نے ایک زوردار جھٹکے کے ساتھ ابکائی سی لی اور اس کے منہ اور ناک سے خون کا فوارہ سا پھوٹ پڑا۔ چند لمحے اس کا وجود جھٹکے سے لیتا رہا پھر ایک جھرجھری سی لے کر ساکت ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

☆☆☆

''حبا......! کل تیری رہائی کا دن ہے اور آج کی یہ رات جیل میں تیری آخری رات ہے۔ آج تو اپنی کہانی سنا دو......؟ کہ تمہارے ساتھ کیا ہوا......؟ تم نے کسے قتل کیا......؟ اور کیوں کیا......؟'' نوری نے لیٹے لیٹے حبا کی طرف کروٹ لیتے ہوئے اداس لہجے میں کہا تو حبا کے بازو بے اختیار نوری کی گردن میں حمائل ہو گئے۔

ایک نوری ہی تو تھی جس کے سہارے اس نے جیل میں پورے سات سال گزار دیئے تھے۔ ورنہ لاوارث انداز میں جیل کے یہ سات سال گزارنا شاید اس کے لئے ممکن ہی نہ ہوتا۔ نوری کو عمر قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ حبا کے وہاں آنے کے تین سال پہلے سے وہیں تھی۔ اس نے قدم قدم پر حبا کا ساتھ دیا تھا۔ یہاں تک کہ اسے لاوارث ہونے کا احساس بھی نہیں ہونے دیا تھا حالانکہ سچائی تو یہی تھی کہ اس نے یہ سات سال لاوارثوں کے انداز میں ہی کاٹے تھے۔ ان سات سالوں میں اس کے لئے صرف ایک ملاقات آئی تھی اور وہ تھے اعجاز چوہدری......اس کے پاپا۔

اس کے بعد انہوں نے پلٹ کر اس کی خبر تک نہیں لی تھی کہ وہ زندہ بھی ہے یا مر گئی اور سانول......! جس کی خاطر وہ آج جیل کی ان سلاخوں کے پیچھے تھی، وہ بھی تو کبھی نہیں آیا تھا۔ اس نے دکھ سے سوچا اور اس کے دل میں ایک ہوک سی

اٹھنے لگی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور پھر اس نے شروع سے لے کر آخر تک وہ سب کچھ نوری کو سنا ڈالا جو آج تک اس کے بار بار پوچھنے پر بھی کبھی اس کے لبوں تک نہیں آیا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''جب وہ مرگیا تو پتا کیا ہوا......؟ سانول قریبی تھانے گیا اور اس نے فاروق کے قتل کا اعتراف کرتے ہوئے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ جانتی ہے نوری......! اس کی اس ادا نے مجھے خرید لیا۔ میری جان بچانے کے لئے اس نے اپنی زندگی داؤ پر لگا دی۔ اسے اپنی زندگی کی پرواہ ہی کب تھی......؟ وہ تو بہت پہلے مرنے جا رہا تھا۔ جب میں نے اسے بچایا۔ پھر میں اسے یہ سب کیسے کرنے دیتی......؟ وہ تو جی ہی میری زندگی رہا تھا پھر نوری میں نے تھانے میں پیش ہو کر بتایا کہ قتل سانول نے نہیں میں نے کیا ہے۔ کیونکہ میں خودغرض نہیں تھی اگر فاروق صرف مجھے مارنے آیا ہوتا تو شاید میں چپ چاپ مر جاتی لیکن وہ تو سانول کے لئے بھی موت بن کر آیا تھا۔ پھر میں کیسے زندہ رہنے دیتی اسے......؟

میں نے یہی سب کچھ تھانے میں بھی بتایا اور یہی نہیں میں نے اس حکیم کا حلیہ بھی بتایا پھر اسے بھی پکڑ لیا گیا۔ میں نے اسے شناخت کیا اور اس نے مجھے ......اس نے بھی بتا دیا کہ وہ زہر مجھے ہی فراہم کر کے گیا تھا۔ یوں سانول کی جان چھوٹ گئی اور مجھے سات سال قید ہوگئی۔

بس یہ ہے میری کہانی......! میرا جرم صرف اتنا ہے کہ میں نے آرزو کی تھی اور نوری......! ''آرزو عیب نہیں'' ...... آرزو تو عبادت ہے، پوجا ہے، پرستش ہے، باپ کی آرزو کی تو وہ کبھی نہیں ملا، سمیر کی آرزو کی وہ بھی نہیں ملا۔ پھر میں نے سانول کی آرزو کی تو وہ بھی نہیں ملا۔ مل کر بھی نہیں ملا۔ جب میری آرزو میں کھوٹ نہیں، میری عبادت، میری پوجا، میری پرستش میں کوئی کمی نہیں تو پھر وہ مجھے کیوں نہیں ملا نوری......! کیوں......؟ وہ تو مجھے کبھی ملنے تک نہیں آیا نوری......! ایسا کیوں......؟'' اس نے نوری کو جھنجوڑ ڈالا۔ نوری کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر

رہے تھے۔حبا سسک رہی تھی۔ٹھیک اسی لمحے موذن نے اللہ کی بڑائی کا اعلان کیا۔

صبح ہو چکی تھی اور پھر جب وہ جیل سے باہر نکل رہی تھی اس وقت وہ سوچ رہی تھی کہ اب وہ کہاں جائے گی......؟ اس کے پاپا اور اس کا سانول دونوں کبھی اس سے جیل میں ملنے تک نہیں آئے تھے تو کیا اسے ان کے پاس جانا چاہئے......؟ جیل کے آہنی دروازے سے نکل کر اس نے آسمان کی طرف نظریں اٹھائیں جیسے اللہ سے شکوہ کر رہی ہو۔

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے نظریں جھکا کر سامنے کی طرف دیکھا تو سفید کلر کی پراڈو کے ساتھ بلیک سوٹ میں ملبوس ایک بارعب شخصیت بانہیں پھیلائے اس کی منتظر تھی۔اس نے دھندلائی ہوئی آنکھوں سے بغور دیکھا تو وہ اس کے پاپا تھے۔ اس نے جلدی جلدی آنکھیں صاف کیں تو اپنے پاپا کے پہلو میں کھڑے جدید تراش کے ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک وجیہہ نوجوان کو جیسے پہلی مرتبہ دیکھا۔ دونوں تیزی سے اس کے قریب آ چکے تھے۔ پھر اسے اپنے پاپا کی آواز سنائی دی۔

''ان سے ملو...... یہ چوہدری گروپ آف انڈسٹریز کے جنرل منیجر اور تمہاری...... تمہاری امانت...... مسٹر سانول قزلباش......!'' وہ پاگلوں کی طرح سانول کا چہرہ تکے جا رہی تھی۔ پھر وہ بے اختیار وہیں سجدے میں گر گئی۔

اس کے منہ سے ایک ہی آواز آ رہی تھی۔ آنسوؤں اور ہچکیوں کے درمیان ایک ہی جملہ

''آرزو عیب نہیں......!''

''میرے مالک......!''

''آرزو عیب نہیں......!''

☆☆☆

جرمِ محبت

اوکاڑہ کینٹ سے نکلتی ہوئی پتلی سی بل کھاتی ہوئی یہ سڑک قصبہ نور شاہ کی طرف جاتی تھی۔ جس پر تھوڑا سا فاصلہ طے کرنے کے بعد سرسبز و شاداب اور لہلہاتے کھیتوں سے سجا یہ گاؤں ''رتی ٹبی'' کہلاتا تھا۔

شام کے سائے اپنے پَر پھیلا چکے تھے۔ خوش الحان پرندے اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرا کرنے کے بعد خاموشی اختیار کر چکے تھے۔ گاؤں کی ایک چوڑی گلی کی نکڑ پر واقع اکرم چوبارے والے کا دو منزلہ مکان اس وقت گہرے سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ لیکن دوسری منزل پہ واقع کمرے کی کھڑکی میں سے روشنی چھن چھن کر باہر نکل رہی تھی۔ جو نیم تاریکی ماحول سے نبرد آزما ہونے کی کمزور کوشش کر رہی تھی۔

کمرے میں ایک ٹیبل، کرسی، ایک بیڈ، ایک طرف سجا ہوا خوب صورت صوفہ، فرش پر بچھا ہوا ایرانی قالین اور ایک سائیڈ پر موجود دیوار گیر الماری جس میں بہت سی کتابیں سجی ہوئی تھیں۔ کمرے میں میز کے برابر پڑی ہوئی کرسی پر ایک متحرک وجود موجود تھا جو میز پر بکھرے ہوئے کاغذوں پر اپنے ہاتھ میں موجود خوب صورت فاؤنٹین پین سے کچھ تحریر کر رہا تھا۔

گھنے لمبے سیاہ بال، گھنی پلکیں، موٹی آنکھیں، ستواں ناک، یہ مریم تھی،

سولہ سترہ سال کی خوب صورت لڑکی۔ اس وقت پورے انہماک سے نوٹس تیار کر رہی تھی۔ بی اے کی اسٹوڈنٹ تھی۔ پوری جانفشانی سے اپنی پڑھائی پر توجہ دیتی تھی۔ حسب معمول اس وقت بھی وہ اپنے کام میں مشغول تھی کہ کمرے میں گونج اٹھنے والی ٹھک کی عجیب سی آواز نے اسے چونکنے پر مجبور کر دیا۔

اس کی متجسس نگاہیں چاروں طرف گردش کرنے لگیں۔ جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اس سے کچھ ہی فاصلے پر کوئی ایسی چیز موجود ہے جو اس سے پہلے کمرے کا حصہ نہیں تھی۔ اس نے حیرت سے اس چھوٹی سی گول سی چیز کی طرف دیکھا اور پھر وہ کرسی سے اٹھ کر اس چیز پر جھک گئی۔

اس نے اس گول سی چیز کو اٹھایا تو اسے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ وہ مٹی کا ایک ڈھیلا تھا جس کے اردگرد بڑی کاریگری کے ساتھ ایک کاغذ لپیٹا گیا تھا۔ اس نے کاغذ کو مٹی کے ڈھیلے سے الگ کیا اور سیدھا کر کے اس پر ایک نظر دوڑائی تو اس کے ساتھ ہی اس کی پیشانی پر ان گنت شکنیں نمودار ہو گئیں۔

پہلا ہی جملہ جو اس کاغذ پر تحریر تھا۔

''جان سے پیاری مریم......!''

پڑھ کر اسے شدید غصہ آیا۔ اس نے باہر گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا اور تیزی سے چلتی ہوئے کھڑکی تک جا پہنچی۔ اس نے سر باہر نکال کر جھانکا، لیکن اردگرد کوئی ذی روح دکھائی نہ دیا۔ گلی بالکل سنسان تھی۔ اس نے حقارت سے کاغذ کے ٹکڑے کی طرف دیکھا اور پھر اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت میں آئے اور کاغذ پرزہ پرزہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے کاغذ کے وہ پرزے مٹی کے ڈھیلے کے ساتھ کھڑکی سے باہر تھے۔ اس نے ماتھے پر در آنے والے بالوں کو ایک جھٹکے سے پیچھے کیا اور دھیرے دھیرے چلتی ہوئی واپس کرسی پر جا بیٹھی۔

چند لمحوں کے لئے اس کا ذہن پراگندہ ہوا۔ لیکن پھر وہ پرسکون ہو گئی۔

اب وہ دوبارہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنی کی بکس کھول کر بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ تیزی سے چل رہا تھا۔ وہ پورے انہماک سے نوٹس تیار کرنے لگی۔

☆☆☆

شہروز کو اپنے گاؤں ''رتی ٹبی'' آئے ہوئے آج تیسرا دن تھا۔ وہ ساہیوال کے ایک کالج میں پڑھتا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں وہیں رہائش پذیر تھا۔ گاؤں میں اس کا آنا جانا کم ہی ہوتا تھا، کیونکہ گاؤں میں پیدا ہونے، پلنے بڑھنے کے باوجود یہاں اس کا دل نہیں لگتا تھا اور لگتا بھی کیسے......؟ یہاں اس کی دلچسپی کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ وہ جب بھی گاؤں آتا، ایک دن سے زیادہ یہاں رہنا دوبھر ہو جاتا۔

لیکن اس مرتبہ کچھ ایسا ہوا تھا کہ تین دن گزر جانے کے باوجود اس نے واپسی کا نام نہیں لیا اور اس کی وجہ صرف وہ ہی جانتا تھا۔

اور یہ وجہ جیتی جاگتی سانس لیتی پریوں کی طرح خوب صورت و نازک مریم تھی۔ جب سے اس نے اسے دیکھا تھا اس کے دماغ میں پھل جھڑیاں سی چھوٹ رہی تھیں۔ ایک عجیب سا احساس اس کے رگ و پے میں سرائیت کر گیا تھا۔

وہ ٹیوب ویل کے پاس اپنے چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ جب اس نے اسے پہلی مرتبہ وہاں سے گزرتے دیکھا اور یہ ایک نظر دیکھنا ہی قیامت ڈھا گیا، وہ بہت دیر تک گم سم بیٹھا اسی طرف دیکھتا رہا جہاں سے وہ گزری تھی۔

اس کے دوست راشد نے اسے کندھے سے پکڑ کر ہلایا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کب کی جا چکی اور خالی پگ ڈنڈی پر دور تک کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

دوسری مرتبہ وہ اپنے گھر سے نکل رہا تھا تو اس نے اسے گلی سے گزرتے ہوئے دیکھا۔ سفید لباس میں ملبوس، سفید ہی دوپٹہ اوڑھے ہوئے وہ بہت مقدس لگ رہی تھی۔ اس کا معصوم و خوب صورت چہرہ بری طرح اسے اپنے سحر میں گرفتار کر گیا۔

وہ قدم بقدم اس کے پیچھے کھنچتا چلا گیا۔ تین چار گلیوں سے گزرنے کے بعد شاید اس کی منزل آگئی۔ وہ غڑاپ سے دروازے میں داخل ہوئی اور گم ہوگئی۔

اسے پتا ہی نہیں چلا تھا کہ کسی کے ہوش و حواس گم ہوئے ہیں۔ وہ دیر تک وہیں کھڑا اس دروازے کو تکتا رہ گیا۔

شہروز اسی گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔ وہیں ہوش سنبھالا تھا۔ لہٰذا وہ گاؤں میں رہنے والے تقریباً ہر فرد سے واقف تھا اور کیوں نہ ہوتا......؟ گاؤں کی آبادی کتنی ہوتی ہے۔ اور چچا اکرم جو گاؤں میں اکرم چوبارے کے نام سے مشہور تھے، وہ تو پشتوں سے اس گاؤں میں آباد تھے۔ ان کے باپ، دادا نے بھی اسی مٹی سے جنم لیا اور اسی مٹی میں مل گئے تھے۔

کچھ دیر تک وہ بے اختیار سا ہو کر وہیں کھڑا رہا۔ لیکن پھر شاید اسے عقل آگئی اور وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے واپس چل دیا۔

اور آج تین دن گزر جانے کے باوجود وہ اس چہرے کو فراموش نہیں کر سکا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ایک عجیب سی بے چینی اس کی طبیعت پر طاری تھی۔ کچھ تھا جو اس کے ذہن میں جوار بھاٹے پیدا کر رہا تھا۔ کچھ مختلف، کچھ ایسا انوکھا عمل تھا جو اس کے اندر ہی اندر کسی لاوے کی طرح پک رہا تھا۔

وہ تین دن سے اپنی اس کیفیت پر سخت پریشان تھا اور آخر کار آج ایک نتیجے پر پہنچ کر مطمئن ہوگیا تھا۔

اس وقت وہ اپنے کمرے میں اندر سے کنڈی لگائے اپنے بیڈ پر موجود تھا۔ ایک خوب صورت رائٹنگ پیڈ و قلم لے کر اس نے کاغذ پر چند جملے لکھے۔ لیکن پھر وہ شاید مطمئن نہیں ہوا۔ اس نے پیڈ پر سے کاغذ کو پھاڑا اور توڑ مروڑ کر ایک طرف اچھال دیا۔ پھر اس نے کچھ تحریر کیا، لیکن وہ کاغذ بھی کمرے میں گرے، دوسرے کاغذات کے ساتھ جا ملا۔

کافی دیر تک یہی صورت حال برقرار رہی۔ پھر شاید اس کی تسلی ہوگئی۔ جو

تحریر وجود میں آئی تھی، وہ شاید اس کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ تحریر مکمل کرنے کے بعد اس نے کاغذ کو پھاڑا اور احتیاط سے تہہ کرنے کے بعد اسے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پھر پھرتی سے کمرے میں بکھرے ہوئے مڑے تڑے کاغذات کو جمع کر کے ایک شاپنگ بیگ میں ڈالا اور گھر سے باہر نکل آیا۔

اس کے قدم تیزی سے ایک طرف اٹھتے جا رہے تھے اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ چچا اکرم کے مکان کے سامنے موجود تھا۔

گلی کی طرف کھلنے والی کھڑکی میں سے ہلکی روشنی نظر آ رہی تھی۔ ان تین دنوں میں بڑی تگ و دو کے بعد وہ اس بات کا پتا چلانے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ یہ ہی کمرہ اس کا مطلوب نظر تھا۔

اس نے اردگرد نظریں دوڑائیں تو جلد ہی اسے اپنی مطلوبہ چیز نظر آ گئی۔ یہ مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیلا تھا، جو اس کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس نے وہ ڈھیلا اٹھایا، پھر جیب میں سے کاغذ کو نکالا۔ ڈھیلا کاغذ کے درمیان میں رکھ کر کاغذ کو احتیاط سے اس کے اردگرد لپیٹا اور پھر مطمئن انداز میں گردن ہلائی۔

ایک لمحہ کے لئے اس کی نظریں اردگرد چکرائیں۔ پھر اس کا ہاتھ گردش میں آیا اور مٹی کا وہ ڈھیلا کاغذ سمیت اڑاتا ہوا کھڑکی سے اندر جا گرا۔

مریم جب معمول نوٹس تیار کر رہی تھی کہ ٹھک کی آواز آئی اور اس نے چونک کر سر اٹھایا اور پھر وہ جیسے اڑتی ہوئی کھڑکی تک جا پہنچی۔ پچھلے پندرہ بیس دنوں سے وہ سخت شش و پنج کا شکار تھی۔ رات کے تقریباً اسی وقت روزانہ ٹھک کی یہ شناسا آواز معمول بن چکی تھی اور وہ جانتی تھی کہ مٹی کا ایک ڈھیلا جس کے اردگرد خوب صورتی سے لپٹا ہوا کاغذ اور کاغذ پر بکھرے ہوئے الفاظ، لیکن باوجود ہزار کوشش کے وہ یہ جاننے سے قاصر تھی کہ یہ حرکت ہے کس کی......؟ کون ہے جو اپنے جذبات و احساسات کو کاغذ پر منتقل کرتا ہے اور پھر مٹی کے ایک ڈھیلے کو پیغام رساں کبوتر بناتے ہوئے ان لفظوں کو کمرے کے عین وسط میں پہنچا دیتا ہے......؟

شروع شروع میں تو اس نے کاغذ کو پڑھنے کی بھی زحمت نہیں کی۔ اسے خواہ مخواہ طیش آجاتا تھا اور کاغذ پرزے پرزے ہو کر واپس کھڑکی کے باہر پہنچ جاتا تھا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ تشویش کے ساتھ ساتھ اسے اس معاملے سے دلچسپی سی پیدا ہوتی چلی گئی۔

پچھلے چار پانچ روز سے روزانہ موصول ہونے والا پیغام اس نے بار بار پڑھا، الفاظ بے شک مختلف ہوتے تھے لیکن لب لباب یہ ہی ہوتا تھا کہ کوئی اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔

دو دن کی مسلسل سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچ چکی تھی کہ کاغذ کی طرف جھپٹنے کی بجائے اگر وہ فوری طور پر کھڑکی تک پہنچ جائے تو شاید اس حرکت کا محرک جان سکے تو وہ ایک ہی چھلانگ میں کھڑکی تک آ پہنچی تھی اور پھر وہ اسے نظر آ گیا۔

نیم تاریک ماحول کے باوجود تیکھے نقوش کا مالک وہ خوب صورت نوجوان اس کی نظروں سے اوجھل نہیں رہا تھا۔ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے بعد جیسے اس پر سکتہ طاری ہوگیا۔ وہ ایک ٹک کھڑکی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ اس کی نظریں مریم کی نظروں سے ٹکرا گئیں اور مریم کا پورا وجود دھیرے دھیرے لرز رہا تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے نوجوان کی مقناطیسی نگاہوں سے کوئی غیر مرئی شعاعیں نکل رہی ہیں۔ جنہوں نے اسے پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ وہ بالکل بے خودسی ہو کر رہ گئی۔ لیکن پھر اس نے ایک جھرجھری سی لے کر جیسے خود کو سنبھالا دیا اور اپنی کیفیت پر غور کرنے لگی۔ ایک عجیب وانوکھا احساس تھا جس سے وہ آج تک ناآشنا تھی۔ پھر اچانک اس کے وجود میں ایک سرکش لہر سی اٹھی۔ اسے اس نوجوان پر شدید غصہ آیا۔

''آخر اسے کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ بلاوجہ اسے پریشان کرے......؟ میرہ کمرہ کسی کے باپ کی جاگیر تو ہے نہیں کہ جس کا دل چاہے اینٹ پتھر اٹھا کر پھینکتا

پھرے...... ہونہہ......!''

اس نے غصے سے سر کو جھٹکا اور اس کے چہرے پر بکھر آنے والے بال اس کے شانوں پر آ گئے۔ اس نے نفرت سے اس نوجوان کو گھورا اور پھر ایک زور دار آواز کے ساتھ کھڑکی کو بند کر دیا۔

وہ واپس اپنی مخصوص نشست کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اچانک گول گول لپٹے ہوئے سفید کاغذ سے اس کی نظریں الجھ کر رہ گئیں۔ اس نے چلتے چلتے رخ تبدیل کیا اور وہ کاغذ اٹھا لیا۔ اسے کھول کر مٹی کا ڈھیلا الگ کیا اور پھر اس کی نظریں اس پر بکھری، تحریر پر پھسلتی چلی گئیں۔

پتا نہیں کیوں وہ الفاظ اس کے دل و دماغ پر عجیب سا سحر طاری کر رہے تھے۔ اس کے وجود میں اچانک اٹھنے والی نفرت کی سرکش لہر ان الفاظ کی مٹھاس اور ٹھنڈک کے مارے ماند پڑتی چلی گئی۔ اب وہ بالکل پرسکون تھی۔ اور ان الفاظ کو ایک بار پھر غور سے پڑھ رہی تھی۔

سیدھا سیدھا اظہار محبت تھا۔ لیکن الفاظ کا بہاؤ اور ان کا استعمال نہایت خوب صورتی سے کیا گیا تھا، جو آخر کار اس پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ اس کی دھڑکنوں کی لے تبدیل ہو رہی تھی۔

پہلی بار اس نے ان لفظوں کے پیچھے چھپے ہوئے جذبوں اور ان کی گہرائی کو محسوس کیا۔ اب اسے یہ الفاظ برے نہیں لگ رہے تھے۔ اسے غصہ بھی نہیں آ رہا تھا۔ ایک لمحے کے لئے اس کے ذہن کے پردوں پر وجیہہ صورت کسی پرچھائی کی طرح نمودار ہوئی، بالکل یوں جیسے پانی پر کوئی عکس لہراتا ہے۔ اس نے بے ساختہ کھڑکی کی طرف دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے قدم دوبارہ کھڑکی کی طرف اٹھنے لگے۔

اس نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ لیکن خالی گلی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ وہ عکس نیم تاریک ماحول کے پردوں میں کہیں گم ہو چکا تھا۔ اس نے بے چینی سے

ادھر ادھر نظریں گھمائیں لیکن اس کا دور دور تک نام ونشان نہیں ملا۔ اس نے ایک نظر ہاتھ میں موجود اس خط کی طرف دیکھا، پھر دوسرے ہاتھ میں موجود مٹی کے چھوٹے سے ڈھیلے کی طرف۔ مٹی کا وہ چھوٹا سا ڈھیلا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے نہایت آہستگی سے کھڑکی کو بند کیا اور پھر سست قدمی سے چلتی ہوئی اپنے بیڈ پر آگری۔

کاغذ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے ایک بار پھر اس تحریر کو بغور پڑھا۔ اس کا ذہن کہیں سے کہیں اسے اڑائے پھر رہا تھا۔ آج وہ نئے جہانوں کا سفر کر رہی تھی۔ نئے جذبوں سے آشنا ہو رہی تھی۔ کچھ بھی تھا لیکن یہ سب کچھ برا تو نہیں تھا۔

کافی دیر تک وہ گم سم خیالوں کے جزیرے میں بھٹکتی رہی۔ پھر اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور اس کی پلکوں کے ریشمی غلاف آہستہ آہستہ گرتے چلے گئے۔ وہ سو چکی تھی، یوں کہ کاغذ کا وہ سفید ٹکڑا اس کے سینے پر دھرا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اس کے اوپر یوں رکھے تھے جیسے اسے خدشہ ہو کہ یہ کاغذ کہیں اس سے چھن نہ جائے۔

☆☆☆

شہروز سخت پریشان تھا۔ پندرہ، دس دن کی مسلسل کوشش کے بعد آج اسے مریم کی جھلک نظر آئی تھی اور اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھا تھا۔ وہ یہی سمجھا تھا کہ اس کے الفاظ اپنا کام کر گئے۔ لیکن جو ردعمل اسے نظر آیا وہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔

ساری رات اس نے کروٹیں بدلتے گزار دی تھی۔ وہ ایک پل نہیں سو سکا تھا۔ آخر کیا کرے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اور اب گاؤں سے باہر برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے بیٹھا وہ یہی سوچ رہا تھا کہ

''آخر اس درد کی دوا کیا ہے......؟''

جیسے کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی تو وہ مزید پریشان ہو گیا۔ اس نے بے

چینی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

''یا خدا......! تو تو دلوں کے حال بہتر جانتا ہے۔ تو ہی کوئی راستہ نکال۔ تو ہی میرے دل کو سکون و قرار بخش سکتا ہے۔''

لیکن اس کی ناکام و نامراد نظروں کو کوئی جواب نظر نہ آیا۔ اس نے آسمان سے نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا تو ہاتھ میں درانتی پکڑے اور گلے میں دوپٹہ لٹکائے اسے ایک نسوانی وجود نظر آیا۔ وہ اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔

گاؤں کی طرف سے نظر آنے والی پگ ڈنڈی پر وہ الہڑ دوشیزہ رانی تھی۔ چچا فیض بخش جٹ کی بیٹی جو یقیناً اپنے کھیتوں میں سے جانوروں کا چارہ کاٹنے کے لئے اس طرف آ رہی تھی۔

جس طرح کوئی ستارہ ٹوٹتا ہے اس کے دماغ میں روشنی کی ایک کرن سی چمکی۔

حیرت ہے کہ پھر دل سے کرن پھوٹ رہی ہے
اس غم کے افق پر تو ستارہ یہ نہیں تھا

اس کے ذہن میں ایک منصوبہ ترتیب پا چکا تھا اور اس منصوبے میں مرکزی کردار رانی کا تھا۔

جوں ہی وہ اس کے قریب آئی اس نے اسے بے ساختہ پکارا۔

''رانی......! ایک منٹ ذرا ادھر آؤ......! میری بات سننا......!''

اور جھومتی، لہراتی بل کھاتی رانی عین اس کے سامنے آ رکی اور پھر کافی منت سماجت کے بعد رانی اس کی مدد کے لئے راضی ہو ہی گئی۔

''ہرے......!'' اس کے دل نے نعرہ لگایا۔ اسے امید ہو چلی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائے گا۔

جب وہ وہاں سے اٹھا تو بالکل مطمئن تھا۔ اب اس کے دل و دماغ میں پریشانی کا نام و نشان تک نہ تھا۔ وہ اپنے سر کا تمام بوجھ رانی کے ناتواں کندھوں پر منتقل کر چکا تھا۔ پھر وہ دھیمے سروں میں سیٹی بجاتا ہوا گاؤں کی طرف جانے والی

پگ ڈنڈی پر چلا جا رہا تھا۔

☆☆☆

مریم کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اور اس کے قدم گاؤں سے باہر جانے والی پگ ڈنڈی پر اٹھتے چلے جا رہے تھے۔ زندگی میں پہلی بار وہ کچھ خوفزدہ بھی تھی۔ اس کی ایک آواز پر جان قربان کرنے والے تین بھائی، انتہائی محبت کرنے والے بابا اور مہربان ماں جن سے کبھی آج تک اس نے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا اور بولتی بھی کیوں......؟ آج تک ایسی نوبت بھی تو نہیں آئی تھی۔ سب کی آنکھ کا تارہ تو تھی وہ سب ہی اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اور آج پہلی بار وہ ان سب کو دھوکا دے کر انجانی راہوں پر گامزن تھی۔

ایک احساسِ جرم اس کے ضمیر پر ٹھوکے دے رہا تھا۔ لیکن وہ جذبہ جو اسے گھر کی چار دیواری سے باہر کھینچ لایا تھا۔ ضمیر کی اس کمزور آواز سے کہیں زیادہ طاقت ور تھا۔

جوانی کے چند منہ زور جذبات ایسے ہی ہوتے ہیں اور عمر کا ایک مخصوص حصہ ہر مرد اور ہر عورت پر ضرور آتا ہے۔ جہاں اپنے آپ کو سنبھالنا پل صراط پر چلنے سے کم نہیں...... اور وہ عمر کے اسی دور سے گزر رہی تھی جہاں ذرا سی بے احتیاطی، ذرا سی لغزش، اسے اندھی کھائی میں پھینک سکتی تھی۔ لیکن وہ ان سب باتوں سے بے نیاز چلی جا رہی تھی۔

اس کے قدم ضمیر کی دستک پر لڑکھڑائے ضرور تھے۔ لیکن پھر جذبات غالب آگئے اور وہ استقامت کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ اس کی منزل برگد کا وہی بوڑھا درخت تھا جہاں شہروز آج بھی موجود تھا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔

ایک لحظہ کو مریم کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئیں۔ اردگرد چھائے ہوئے سناٹے کو محسوس کر کے اس نے گھبرا کر چاروں طرف دیکھا۔ جلد ہی اس کی

نظریں ایک متحرک وجود پر ٹھہر گئیں۔ وہ رانی تھی، جو کچھ ہی فاصلے پر کھیت میں چارہ کاٹتے کاٹتے کھڑی ہوگئی تھی اور اب اس طرف دیکھ رہی تھی۔

اس نے ہاتھ لہرا کر مریم کا حوصلہ بڑھایا اور مریم کے ہونٹوں سے ایک طویل سانس خارج ہوگئی۔

اپنے سے کچھ ہی فاصلے پر ایک ذی روح کی موجودگی کا احساس اس کے دل و دماغ کو تقویت بخش گیا۔ اب وہ پورے اعتماد سے شہروز کی نظروں سے نظریں ملائے بیٹھی تھی۔ پھر شہروز کے لبوں سے لرزتی ہوئی سی آواز برآمد ہوئی۔

''مریم......! تم اپنے نام کی طرح پاکیزہ، معصوم اور خوب صورت ہو۔ آج تم میری خوشی کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ آج تم نے یہاں آکر مجھے زندگی کی نوید دے دی۔ میں اپنی خوش بختی پر نازاں ہوں۔ یقین مانو جس دن سے میں نے تمہیں دیکھا مجھے دین و دنیا کا کوئی ہوش نہیں رہا۔ میری زندگی کا مقصد صرف اور صرف تم بن گئیں۔ تمہارا حصول میری زندگی اور تمہاری جدائی میری موت ہے۔ میری یہ سانسیں تمہارے ہی نام کا ورد کرتی ہیں اور اگر تم نے ان کی زبان سے اس نام کو الگ کیا تو سانسوں کی یہ ڈور ٹوٹ جائے گی۔ پلیز مریم......! اب مجھ سے جدا مت ہونا۔''

اور مریم اس کی طرف دیکھتی رہ گئی۔ یہ الفاظ تو نہیں تھے، یہ تو کوئی جادو تھا اور جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔

مریم پر جادو پوری طرح چل چکا تھا۔ وہ بولتی بھی تو کیا......؟

پھر شہروز نے اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھ آگے بڑھائے اور سنگ مرمر کی طرح سفید لیکن نرم و نازک مریم کا خوب صورت ہاتھ تھام لیا۔ اس نے آہستہ آہستہ مریم کے ہاتھ کو اوپر اٹھایا اور پھر مریم کی ہتھیلی کی پشت شہروز کے ہونٹوں کے لمس سے دہک اٹھی۔

☆☆☆

افسردہ وملول شہروز چارہ کا بڑا گٹھڑا بندھوا رہا تھا۔ بہت بڑی چادر کے اندر بھینسوں کے لئے تازہ کاٹا ہوا سبز چارہ تہہ در تہہ جما ہوا تھا۔ چادر کے دو پلو شہروز کے ہاتھ میں تھے اور دو رانی کے ہاتھ میں۔ دونوں نے اپنی اپنی طرف کھینچ کر اندازہ لگایا کہ چارہ چادر کے اندر اچھی طرح جمع ہو چکا ہے۔

شہروز نے اس پر مضبوط گرہ لگائی اور دھپ سے کھیت میں ہی بیٹھ گیا۔ وہ بہت غم زدہ نظر آ رہا تھا۔ رانی نے ایک انگلی کی مدد سے پیشانی پر آیا ہوا پسینہ صاف کیا اور چارہ کے گٹھڑ پر بیٹھ گئی۔

''دیکھو شہروز......! کسی نہ کسی طرح تو تمہیں انہیں راضی کرنا ہی ہوگا۔ اگر تمہارے والدین تمہارا ساتھ نہیں دیں گے اور مریم کے ساتھ رشتہ مانگنے کے لئے نہیں جائیں گے تو معاملہ کیسے حل ہوگا......؟''

''تم سمجھتی کیوں نہیں رانی......! میں اپنی پوری کوشش کر چکا ہوں۔ لیکن میرے گھر والے اس رشتے پر ہرگز تیار نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک چچا اکرم اور ہماری مالی حیثیت کا فرق زمین و آسمان کا ہے۔ ان کی ذات اور ہے، ہماری اور...... لہٰذا وہ کسی بھی صورت اس بات پر راضی نہیں ہیں۔ میں سخت پریشان ہوں کہ آخر اس مسئلے کا کیا حل نکالا جائے......؟ اور جو کچھ میں نے تم سے کہا ہے بہت سوچ بچار کے بعد ہی میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں۔

تمہیں اللہ کا واسطہ......! تم حرف بہ حرف تمام صورت حال اور اس کے بعد اس کا جو حل میں نے تلاش کیا ہے، مریم کو بتاؤ......! اور اسے اس بات پر راضی بھی کرو۔''

شہروز نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''نہ بابا......! نہ...... میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتی اور میں یہ ذمہ داری لے ہی نہیں سکتی۔ کل کلاں اگر کسی کو پتا چل گیا کہ اس ساری کہانی میں میرا بھی ہاتھ تھا تو میرا بابا تو مجھے کچا ہی کھا جائے گا۔ خدا کا واسطہ شہروز......! تم مجھ سے اتنی

خطرناک خطرناک باتیں نہیں کرو۔ تمہارے ارادے ٹھیک نہیں اور جو قدم تم اٹھانا چاہ رہے ہو، اس میں کسی کی جان بھی جا سکتی ہے۔ میں ایسا کچھ نہیں کرنے والی۔'' رانی نے گھبراہٹ آمیز انداز میں اپنی بات مکمل کی۔ لیکن دوسرے ہی لمحے وہ گھبرا کر گٹھڑ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''چھچھ...... چھوڑو...... چھچھ...... چھوڑو...... پاگل ہوگئے ہو...... یہ کیا کر رہے ہو......؟'' رانی کا انداز مزید گھبراہٹ آمیز تھا۔ رانی کا جملہ مکمل ہوتے ہی شہروز نے اس کے پاؤں پکڑ لئے تھے اور اس کا سر اس کے قدموں میں جا پڑا تھا اور وہ زار و قطار رو رہا تھا اور رانی عجیب بے بس انداز میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب وہ کیا کرے......؟ ایک طرف شہروز کی بے چارگی اور دوسری طرف اس کی سہیلی اور اس کے خاندان کی عزت، وہ چند لمحوں تک شش و پنج کا شکار رہی۔ پھر اس نے شہروز کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی۔ شہروز نے چہرہ اوپر اٹھایا تو آنسو اس کے رخساروں کو بھگو رہے تھے۔

''اچھا بابا......! اچھا...... میں پوری کوشش کروں گی کہ تمہاری بات مریم کی سمجھ میں آجائے۔ اب یہ رونا دھونا بند کرو اور یہ گٹھڑ مجھے اٹھواؤ......!''

''وہ مارا......!'' شہروز کے دل میں ایک نعرہ مستانہ گونج اٹھا۔ اس نے جلدی جلدی آنکھیں صاف کیں اور پھر دوسرے ہی لمحے چارے کا جہازی سائز گٹھڑ رانی کے سر پر منتقل کر دیا۔

رانی انتہائی تیز رفتاری سے وہ گٹھڑ اٹھائے گاؤں کی طرف جانے والی پگ ڈنڈی پر چلی جا رہی تھی اور شہروز وہیں کھڑا ہوا دور ہوتی رانی کی طرف تک رہا تھا۔ اب اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ رقص کناں تھی۔

☆☆☆

نینوں کی مت مانیو رے

پاکستانی ورچوئل لائبریری

نینوں کی مت سنیو
نیناں ٹھگ لیں گے
جگتے جادو پھونکیں گے
نیندیں بنجر کر دیں گے
بھلا ماندہ دیکھے نہ پرایا نہ سگا رے
نینوں کو تو ڈسنے کا چسکا لگا رے
نینوں کا زہر نشیلا رہے
نینوں کی زبان پہ بھروسہ نہیں آتا
لکھت، پڑھت، نہ رسید نہ کھاتا
نیناں ڈس لیں گے
ڈس لیں گے

بہت ساری ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کپاس کے لہلہاتے کھیت جن پر پیلے پیلے رنگ کے کھلے ہوئے پھول لاؤڈ اسپیکروں کی طرح نظر آ رہے تھے اور کہیں کہیں ان پھولوں کے ساتھ گول گول کپاس کے ٹینڈے بھی نظر آ رہے تھے، جبکہ کسی کسی پودے پر کہیں کہیں روئی بننا بھی شروع ہوگئی تھی۔ ہوا کے ساتھ ساتھ سیدھے کھڑے ہوئے یہ پودے وجد کے عالم میں تھے۔ جھوم جھوم کر رقص کر رہے تھے۔

گہرے سبز رنگ کے پانچ کونوں والے یہ بڑے بڑے پتے پودوں کے اس رقص کے ساتھ میوزک کا کام دے رہے تھے۔ پتوں کے کھڑکھڑانے کی یہ آواز کانوں کو بہت بھلی معلوم دے رہی تھی۔

کھیت کے کنارے برگد کے بوڑھے درخت کے نیچے اس وقت دو جوان دل بے ترتیب انداز میں دھڑک رہے تھے۔ ان میں سے ایک مریم اور دوسرا شہروز تھا۔ لیکن اس بے ترتیبی کا سبب دونوں طرف مختلف تھا۔

شہروز کی دھڑکنوں کی بے ترتیبی خوشی کی وجہ سے تھی، اس کا مطلوب نظر اس کے سامنے تھا اور اس کی والہانہ نظریں مریم کے چہرے پر صدقے واری ہو رہی تھیں۔ اس کا یوں اس کے ایک بلاوے پر چلے آنا اس پر ایک عجیب سا نشہ طاری کر دیتا تھا۔ ایک عجیب سا احساس غرور اس کے پورے وجود کا احاطہ کر لیتا تھا۔

لیکن دوسری طرف مریم کی دھڑکنیں گھبراہٹ اور پریشانی کی وجہ سے اعتدال پر نہ رہی تھیں۔ رانی کی، کی ہوئی ایک ایک بات اس کے لئے کسی ایٹم بم سے کم ثابت نہ ہوئی تھی۔

برگد کا یہ بوڑھا درخت پچھلے ایک مہینے سے اس کی محبتوں، جذبوں اور ان جذبوں میں چھپی سچائیوں کا گواہ تھا۔ اس نے اس بوڑھے درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر گھنٹوں شہروز سے باتیں کی تھیں۔ وہ کبھی اتنا پریشان نہیں ہوئی تھی جتنا آج تھی۔

رانی کی کی ہوئی باتوں کے دھماکے اس کے جسم و جان کو لرزائے دے رہے تھے۔ ستم یہ کہ شہروز نے بھی ان باتوں کی تائید کرتے ہوئے مریم کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور مریم کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ ملے۔

اس کا دل زور زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ لیکن جو بھی باتیں اس نے اب تک سنی تھیں، کوئی دوسرا راستہ اس کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا تھا اور وہ کسی حد تک شہروز کی باتوں کی قائل ہو چکی تھی۔

''لل...... لیکن شہروز......!''

''لیکن ویکن کچھ نہیں...... ہمارے پاس یہ ہی ایک آخری راستہ بچا ہے یا تو میرا ساتھ دو یا پھر مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ......!''

''کیسی باتیں کرتے ہو شہروز......! میں تو یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ اس کے بعد کیا ہوگا......؟ کیا تمہارے پاس مستقبل کی کوئی پلاننگ بھی موجود ہے یا یہ صرف ایک جذباتی فیصلہ ہے......؟''

مریم نے شہروز کی بات کاٹتے ہوئے کہا تو شہروز گویا ہوا۔

''مستقبل بھی اللہ کی کرم نوازی سے اچھا ہی رہے گا۔ بس تم میرا ساتھ دو اور جیسا میں نے سمجھایا ہے بالکل ویسا ہی کرو۔ میرے پاس رقم کا زیادہ انتظام نہیں ہے۔ لیکن ہاتھ پاؤں سلامت ہیں۔ پڑھا لکھا ہوں۔ اللہ نے عقل بھی دے رکھی ہے۔ تمہیں بھوکا نہیں ماروں گا۔''

''رقم کی تو تم فکر نہ کرو...... کچھ نہ کچھ انتظام میں بھی کر ہی لوں گی۔''

''تو پھر دیر کس بات کی......؟ کل صبح سورج نکلنے سے پہلے میں اسی جگہ تمہارا انتظار کروں گا۔'' اور پھر مریم وہاں نہ رکی اور شہروز دور جاتی ہوئی مریم کی پشت پر نظریں جمائے گہری سوچ میں مستغرق تھا۔

☆☆☆

''چائے والا بھائی جان...... روٹی ہے، نان ہے، چاول ہے، تازہ ناشتہ صاحب...... حلوہ پوری کا ناشتہ......'' بھانت بھانت کی آوازیں، طرح طرح کی بولیاں اور بے ہنگم شور کے درمیان ایک خوب صورت ہینڈ کیری تھامے کندھے پر بیگ لٹکائے سفید چادر میں لپٹی مریم اس وقت حسب معمول بہت حسین لگ رہی تھی۔

اور پلیٹ فارم پر اس کے ساتھ چلتا ہوا شہروز اردگرد کے ماحول سے بے نیاز مریم کے سراپے کو گھورتے ہوئے یوں چل رہا تھا جیسے اس کی دنیا مریم سے شروع ہو کر مریم پر ختم ہوتی ہو۔

مریم کی طرح پاک ہیں آنکھوں کے جھروکے
ہم دیکھتے ہیں تم کو فرشتوں کی نظر سے

لیکن دلوں کا حال تو اللہ ہی جانتا ہے۔ شہروز کی نظروں میں پیار تھا، خلوص تھا، یا کوئی اور ہی جذبہ کارفرما تھا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنا اتنا آسان بھی نہ تھا۔ البتہ اس کی وارفتگی اور اس کا انہماک بہت سے لوگوں کو ان کی طرف متوجہ کر

گیا تھا۔

ایک بڑے میاں نے اپنے ساتھ بیٹھی ہوئی بڑی بی کو ٹھوکا دیا اور بولے۔

''ہائے ہائے...... قسم سے جوانی یاد آ گئی۔''

''بس رہنے دو...... آپ کو تو آج تک اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ ایک محبت بھری نظر گھر میں ہی مجھ پر ڈالی ہو۔ ایسی دیدہ دلیری آپ کے بس میں کہاں......؟'' بڑی بی اور بڑے میاں کی یہ تکرار مریم سے چھپی نہ رہ سکی تھی اور اس کے قدموں کی رفتار خود بخود تیز ہوگئی۔ وہ دو تین مرتبہ پہلے بھی شہروز کو ٹوک چکی تھی لیکن شہروز تو جیسے اس میں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

پلیٹ فارم کے آخری کنارے کے قریب ایک خالی بینچ نظر آیا تو وہ دونوں اس پر جا بیٹھے۔

''دیکھو نا...... تمہارا یہ انداز پلیٹ فارم پر کسی سے بھی چھپا نہیں رہ سکا۔ لیکن تم ہو کہ تمہیں احساس تک نہیں ہوتا۔ اب تو میں ہمیشہ کے لئے تمہارے ساتھ ہوں، پھر ایسی بھی کیا بے چینی......؟''

مریم کی بات سن کر شہروز جیسے سنبھل کر بیٹھ گیا۔

''ہاں......! تم ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ شاید میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو رہا ہوں۔ اچھا تم یہیں بیٹھو میں ٹکٹوں کا کچھ انتظام کرتا ہوں۔'' یہ کہتے ہوئے شہروز پلیٹ فارم کی عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ٹن ٹن گھنٹی بجنے کی آواز سنائی دی اور مسافروں میں افراتفری کا سماں پیدا ہوگیا۔ گھنٹی کی آواز شاید کسی ٹرین کی آمد کا اعلان تھا۔ دور سے ٹرین کی وسل سنائی دی اور گہما گہمی میں مزید اضافہ ہوگا ی۔

مریم نے پریشانی سے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ جلد ہی شہروز اسے ایک جانب سے آتا دکھائی دیا تو اس کی جان میں جان آئی۔ شہروز ٹکٹیں لے آیا تھا۔ کچھ ہی دیر کے بعد ٹرین بھی پلیٹ فارم پر آ لگی اور وہ دونوں اپنی اپنی سیٹوں

پر جا بیٹھے۔
اگلے دن نو بجے کے قریب ٹرین کے پہیوں نے جس پلیٹ فارم کو چھوا وہ ہی ان کی منزل تھی۔ یہ کراچی کینٹ کا اسٹیشن تھا۔
ٹرین سے اترنے کے بعد انہوں نے سیڑھیاں چڑھ کر پل کراس کیا اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے۔
بالکل سامنے لوہے کی پول سے لگا کر ان کے ساتھ زنجیریں باندھی گئی تھیں جو شاید ہیوی گاڑیوں کا راستہ روکنے کے لئے تھیں۔ مریم کے پیچھے پیچھے اس کا ہینڈ کیری لڑکھڑاتا چلا آ رہا تھا۔ زنجیروں کے درمیان میں موجود راستے سے ہوتے ہوئے جب وہ آگے نکلے تو سامنے یہ ریزرویشن آفس کے ساتھ ہی ایک جگہ پر پلاسٹک کی بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مریم نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ سوئٹس شاپ تھی وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔
شہروز دکان میں جا کر دو کولڈ ڈرنک لے آیا۔ اس نے ایک کولڈ ڈرنک مریم کے ہاتھ میں تھمائی اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔
''مریم......! تمہارے پاس کوئی نقدی یا اس قسم کی کوئی چیز تو موجود نہیں ہے......؟''
''ہاں ہے...... کیوں......؟''
''اصل میں میں تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں بتانا بھول گیا...... یہ کراچی ہے۔ رکشہ ٹیکسی یا گاڑی کسی بھی سگنل پر رکے تو پستول کی نالی سر سے آ لگتی ہے اور بندے کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ یہاں معمول کی بات ہے۔ اگر کچھ ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ سب کچھ میرے حوالے کر دو۔ قریب ہی بینک میں میرا اکاؤنٹ بھی ہے اور لاکر بھی۔ بہتر ہوگا کہ اگر ایسا کچھ ہے تو اسے ہم یہیں محفوظ کر دیں۔ تاکہ بوقت ضرورت ہمارے کام آ سکے۔''
مریم نے کندھے سے لٹکا ہوا بیگ اتارا اور اسے کھول کر ایک بڑا سا پھولا

ہوا خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اس میں سات لاکھ ہیں...... میرے خیال میں ہمارے قدم جمانے کے لئے یہ خاصی معقول رقم ہے۔ اس کے علاوہ زیورات کے کچھ سیٹ ہیں۔''

پھر اس نے ہینڈ کیری کھولا اور سرخ رنگ کے چار خوب صورت باکس نکال کر شہروز کے حوالے کر دیئے۔

شہروز اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ خوب صورت باکس زیورات کے لئے مخصوص ہیں۔ اس نے ایک باکس کھول کر دیکھا تو اس میں گولڈ کا ایک خوب صورت سیٹ جگمگا رہا تھا جو خاصا وزنی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے باکس بند کیا اور مریم سے مخاطب ہوا۔

''تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو...... میں پیسے اکاؤنٹ میں ڈال کر اور زیورات لاکر میں رکھ کر ابھی آیا۔''

''زیادہ دیر تو نہیں لگے گی......؟'' مریم نے پریشان انداز میں پوچھا۔

''بس...... یوں گیا اور یوں آیا......!''

اور پھر شہروز دور نظر آنے والے اسٹیشن کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

''بھائی عالم......! معاملہ مشکوک ہے۔'' فاضل نے تقریباً پندرہویں دفعہ اپنی بات دہرائی۔

''اچھا یار......! پھر بتاؤ کیا کروں......؟ کتنی بار بتاؤ گے......؟'' عالم نے جل کر کہا۔

پیشے کے لحاظ سے دونوں دو نمبر کام کرتے تھے اسی کام کے سلسلے میں وہ آج اوکاڑہ سے کراچی پہنچے۔ آتے وقت ان کی سیٹیں شہروز اور مریم کے قریب ہی تھیں۔ عالم اور فاضل کی پشت مریم اور شہروز کی طرف تھی۔

پر جا بیٹھے۔

اگلے دن نو بجے کے قریب ٹرین کے پہیوں نے جس پلیٹ فارم کو چھوا وہ ہی ان کی منزل تھی۔ یہ کراچی کینٹ کا اسٹیشن تھا۔

ٹرین سے اترنے کے بعد انہوں نے سیڑھیاں چڑھ کر پل کراس کیا اور پلیٹ فارم سے باہر نکل آئے۔

بالکل سامنے لوہے کی پول سے لگا کر ان کے ساتھ زنجیریں باندھی گئی تھیں جو شاید ہیوی گاڑیوں کا راستہ روکنے کے لئے تھیں۔ مریم کے پیچھے پیچھے اس کا ہینڈ کیری لڑکھڑاتا چلا آ رہا تھا۔ زنجیروں کے درمیان میں موجود راستے سے ہوتے ہوئے جب وہ آگے نکلے تو سامنے یہ ریزرویشن آفس کے ساتھ ہی ایک جگہ پر پلاسٹک کی بہت سی کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ مریم نے نظریں اٹھا کر دیکھا وہ سوئٹس شاپ تھی وہ دونوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

شہروز دکان میں جا کر دو کولڈ ڈرنک لے آیا۔ اس نے ایک کولڈ ڈرنک مریم کے ہاتھ میں تھمائی اور اس کے ساتھ بیٹھتے ہوئے بولا۔

''مریم......! تمہارے پاس کوئی نقدی یا اس قسم کی کوئی چیز تو موجود نہیں ہے......؟''

''ہاں ہے...... کیوں......؟''

''اصل میں میں تمہیں یہاں کے حالات کے بارے میں بتانا بھول گیا...... یہ کراچی ہے۔ رکشہ ٹیکسی یا گاڑی کسی بھی سگنل پر رکے تو پستول کی نالی سر سے آ لگتی ہے اور بندے کے پاس جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ اس سے محروم ہو جاتا ہے اور یہ یہاں معمول کی بات ہے۔ اگر کچھ ہے تو بہتر ہوگا کہ وہ سب کچھ میرے حوالے کر دو۔ قریب ہی بینک میں میرا اکاؤنٹ بھی ہے اور لاکر بھی۔ بہتر ہوگا کہ اگر ایسا کچھ ہے تو اسے ہم یہیں محفوظ کر دیں۔ تاکہ بوقت ضرورت ہمارے کام آسکے۔''

مریم نے کندھے سے لٹکا ہوا بیگ اتارا اور اسے کھول کر ایک بڑا سا پھولا

ہوا خاکی لفافہ اس کی طرف بڑھا دیا۔

''اس میں سات لاکھ ہیں...... میرے خیال میں ہمارے قدم جمانے کے لئے یہ خاصی معقول رقم ہے۔ اس کے علاوہ زیورات کے کچھ سیٹ ہیں۔''

پھر اس نے ہینڈ کیری کھولا اور سرخ رنگ کے چار خوب صورت باکس نکال کر شہروز کے حوالے کر دیئے۔

شہروز اندازہ لگا چکا تھا کہ یہ خوب صورت باکس زیورات کے لئے مخصوص ہیں۔ اس نے ایک باکس کھول کر دیکھا تو اس میں گولڈ کا ایک خوب صورت سیٹ جگمگا رہا تھا جو خاصا وزنی معلوم ہو رہا تھا۔ اس نے باکس بند کیا اور مریم سے مخاطب ہوا۔

''تم تھوڑی دیر یہیں بیٹھو...... میں پیسے اکاؤنٹ میں ڈال کر اور زیورات لاکر میں رکھ کر ابھی آیا۔''

''زیادہ دیر تو نہیں لگے گی......؟'' مریم نے پریشان انداز میں پوچھا۔

''بس...... یوں گیا اور یوں آیا......!''

اور پھر شہروز دور نظر آنے والے اسٹیشن کے بیرونی گیٹ کی جانب بڑھ گیا۔

☆☆☆

''بھائی عالم......! معاملہ مشکوک ہے۔'' فاضل نے تقریباً پندرہویں دفعہ اپنی بات دہرائی۔

''اچھا یار......! پھر بتاؤ کیا کروں......؟ کتنی بار بتاؤ گے......؟'' عالم نے جل کر کہا۔

پیشے کے لحاظ سے دونوں دو نمبر کام کرتے تھے اسی کام کے سلسلے میں وہ آج اوکاڑہ سے کراچی پہنچے۔ آتے وقت ان کی سیٹیں شہروز اور مریم کے قریب ہی تھیں۔ عالم اور فاضل کی پشت مریم اور شہروز کی طرف تھی۔

شہروز اور مریم کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی ان میں اتنی دلچسپی لے رہا ہے۔لیکن وہ دونوں پوری طرح ان کی طرف متوجہ رہے تھے۔

عالم نے تو پھر بھی کسی خاص گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔لیکن فاضل اس معاملے میں پوری طرح سے سرگرم نظر آ رہا تھا۔ وہ تمام راستے ان کی طرف خصوصی توجہ دیتا آیا تھا اور بار بار عالم سے کہتا رہا تھا۔

''بھائی عالم......! معاملہ مشکوک ہے۔'' کچھ ان دونوں کی گفتگو اسے صاف سنائی دی تھی۔ وہ دونوں کے نام سے واقف ہو چکا تھا اور کہانی بھی کسی حد تک سمجھ گیا تھا۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا کھچڑی پک رہی تھی۔ وہ ان کی باتیں سنتا اور کسی گہری سوچ میں گم ہو جاتا۔ پھر اچانک ہڑبڑا کر کہتا۔

''عالم......! معاملہ مشکوک ہے۔''

ٹرین کی حد تک تو عالم بھی ہوں ہاں میں جواب دیتا رہا لیکن اب وہ چڑ گیا تھا۔

''اگر معاملہ مشکوک ہے بھی تو ہمیں اس سے کیا لینا دینا......؟''

''یہ ہی تو تمہیں نہیں پتا عالم......! یہ بہت بڑا بزنس ہے۔تم دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں......؟''

شہروز اور مریم بیٹھے کولڈ ڈرنک پی رہے تھے اور وہ دونوں لوئر کلاس کے مسافر خانے کی سیڑھیوں پر کھڑے آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ فاضل کی نظریں ان دونوں پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ دونوں ٹہلتے ہوئے باہر نکلے اور گیٹ کی جانب چل دیئے۔

''عالم......!''

''جی بھائی فاضل......!''

''تم یہیں رکو......! ابھی یہ چھوکرا باہر نکلے گا، تم اس کا پیچھا کرنا۔ میں یہاں کے معاملات سنبھالتا ہوں۔''

''اماں چھوڑو بھائی فاضل......! جو بھی ہے، جیسا بھی ہے انہیں ان کے حال پہ چھوڑو...... بھوک سے برا حال ہو رہا ہے۔ کچھ کھانا وانا کھاتے ہیں۔ کولڈ ڈرنک پیتے ہیں۔ وہ دیکھو دونوں کتنے مزے سے کولڈ ڈرنک پی رہے ہیں۔''

''عالم......!''

''جی بھائی فاضل......!''

''جیسا میں کہتا ہوں ویسا کرو......!''

''ٹھیک ہے بھائی فاضل......!''

''میں واپس جا رہا ہوں۔ جیسا میں نے سمجھایا اس میں انیس بیس کا فرق بھی نہیں ہونا چاہئے۔''

عالم کی ڈیوٹی دوسری طرف لگا کر فاضل واپس مڑ گیا۔ یوں عالم فاضل الگ الگ محاذوں پر مورچہ زن ہو گئے۔

☆☆☆

روشنیوں اور رنگوں کے شہر کراچی میں رونق اور گہما گہمی عروج پر تھی۔ روشنیاں جل اٹھی تھیں اور چاروں طرف روشنیاں ہی روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ لیکن مریم کے دل و دماغ پر اب اندھیرے چھانے لگے تھے۔

صبح کے نو سے رات نو تک کا ٹائم اس نے اسٹیشن پر ہی گزار دیا تھا۔ شہروز گیا تھا تو واپس نہیں آیا تھا۔ مریم نے ادھر ادھر گھوم پھر کر اسے تلاش کرنے کی کوشش کی۔ لیکن بے سود...... وہ بار بار بکنگ آفس، پلیٹ فارم اور مسافر خانے کا چکر لگاتی، لیکن پھر مایوس و نامراد واپس آ کر وہیں بیٹھ جاتی۔

ایک بار بیرونی دروازے سے باہر جا کر بھی دیکھ آئی تھی۔ انجانا شہر، انجانے لوگ، انجانے چہرے، گاڑیوں کا اژدھام، ٹریفک کا شور یہ سب اس کے حواس مختل کئے دے رہا تھا۔ وہ گھبرا کر واپس لوٹ آئی اور اس کی یہ گھبراہٹ فطری سی بات تھی۔ وہ تو کبھی اتنی دور، اتنے لمبے سفر پر گئی ہی نہ تھی۔ اپنے گھر، اپنے شہر،

اپنے ماں، باپ سے سینکڑوں میل دور بے یار و مددگار حالت میں وہ گھبراتی نہ تو اور کیا کرتی......؟

اس کی یہ بے چینی اور بدحواسی فاضل کی نظروں سے چھپی ہوئی نہ تھی۔ وہ پوری باریک بینی سے ماحول پر نظر رکھے ہوئے تھا اور اس کے اردگرد منڈلاتا رہا تھا۔ لیکن پوری ہوشیاری سے اس کوشش میں تھا کہ اپنے اردگرد مریم اسے دیکھ نہ لے اور وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب رہا تھا۔

بے چینی اور گھبراہٹ کا یہ عالم صرف مریم پر ہی طاری نہ تھا۔ فاضل کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی، کیونکہ عالم بھی واپس نہیں آیا تھا۔

شہروز کے تعاقب میں روانہ ہوتے ہوئے ایک مرتبہ عالم اور فاضل کی نظریں چار ہوئی تھیں اور فاضل نے اس کی طرف انگوٹھا بلند کرتے ہوئے اس کا حوصلہ بڑھایا تھا۔ لیکن پورا دن گزر چکا تھا۔ شہروز واپس آیا تھا اور نہ ہی عالم، پتا نہیں ان کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ انتظار کی یہ گھڑیاں اتنی طویل اور اتنی کرب ناک تھیں اس کا اندازہ مریم سے بہتر اور کوئی نہیں لگا سکتا تھا۔ اس کا کلیجہ منہ کو آرہا اور وہ سخت پریشانی کا شکار تھی۔

یہ ہی وہ وقت تھا جب فاضل پر اعتماد قدموں سے چلتا ہوا اچانک اس کے سامنے جا ٹھہرا۔

''بی بی......! آپ کا نام مریم ہے......؟''

اور مریم سہم کر رہ گئی۔

فاضل کی مکروہ شکل دیکھ کر اسے انتہائی خوف محسوس ہوا تھا۔

''کک......کون......آپ کون ہیں......؟''

''آپ شہروز کے ساتھ یہاں آئی ہیں......؟'' فاضل نے اس کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے دوسرا تیر پھینکا جو ٹھیک نشانے پر لگا۔ شکار زخمی ہو چکا تھا۔ وہ ایک دم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔

''آپ...... آپ...... شہروز کو جانتے ہیں...... کہاں ہے وہ......؟''

''جی میں شہروز کا دوست ہوں۔ آپ کے بارے میں اس نے پہلے ہی فون پر مجھے سب کچھ بتا دیا تھا۔ کراچی آکر آپ لوگوں کو میرے ہی گھر رکنا تھا۔ لیکن افسوس......!''

''کیا مطلب ہے آپ کا......؟ وہ خیریت سے تو ہے......؟ کیا ہوا ہے اسے......؟''

''ہاں ہاں...... آپ بالکل پریشان نہ ہوں...... وہ زندہ اور صحیح سلامت ہے۔ ذرا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے۔ ایک تیز رفتار کار نے سڑک پر اسے سائیڈ مار دی تھی۔ جس سے اسے کافی چوٹیں آگئیں۔ اسپتال والوں کو اس نے میرا پتا دیا تو مجھے پتا چلا، میں ابھی ابھی اسے اسپتال سے گھر منتقل کر کے آیا ہوں۔ گھر پہنچ کر اس نے مجھے آپ کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ کے حوالے سے وہ سخت پریشان تھا اور اب اس نے مجھے آپ کے لباس اور حلیے کے مطابق بتایا اور یہ بھی بتایا کہ آپ یہاں بیٹھی ہوئی ملیں گی۔ لہٰذا میں آپ کو لینے یہاں آ پہنچا۔

وہ تو خود یہاں آنا چاہتا تھا لیکن اس کی حالت ایسی نہ تھی کہ وہ فوری یہاں پہنچ پاتا۔ مجبوراً مجھے آنا پڑا۔ آپ چلیں میرے ساتھ شہروز آپ کا انتظار کر رہا ہے۔''

اور مریم نے سکون کا سانس لیا۔ جہاں وہ شہروز کے ایکسیڈنٹ اور چوٹیں لگنے کا سن کر پریشان ہوئی تھی۔ وہیں یہ خبر کہ اس نے اس سے دھوکا نہیں کیا۔ اس کے لئے گہری طمانیت کا باعث تھی۔

اب فاضل کی مکروہ شکل اسے اتنی مکرہ نہیں لگ رہی تھی۔

اس نے جلدی سے بیگ کندھے سے لٹکایا، چادر سے کیا گیا نقاب درست کیا۔ ہینڈ کیری پکڑا اور روانگی کے لئے تیار ہوگئی۔

اسے بالکل یہ اندازہ نہیں تھا کہ یہ سفر جس پر جانے کے لئے وہ تیار ہوئی

ہے یہ کنویں سے کھائی کی طرف کا سفر تھا۔ یہ اندھیروں کا سفر تھا۔ لیکن وہ ہر بات سے بے نیاز آنکھوں میں شہروز کی صورت سجائے جلد سے جلد اس تک پہنچنا چاہتی تھی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ کر فاضل کے ساتھ کسی انجانی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

☆☆☆

فاطمہ گہری نیند سو رہی تھیں کہ ایک دلدوز نسوانی چیخ سن کر بڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ ابھی ان کے اوسان پوری طرح بحال نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور چیخ سنائی دی۔ لیکن اس دوسری چیخ کا درمیان ہی سے گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔ بالکل یوں لگا تھا جیسے چلتے ٹیپ ریکارڈر کا سوئچ نکال دیا گیا ہو۔ شاید چیخنے والی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا گیا ہے انہوں نے سوچا۔

انہوں نے جلدی سے چپل پہنی اور کمرے سے باہر نکل آئیں۔ چاروں طرف گہری تاریکی اور مکمل سناٹا تھا۔ کہیں بھی کوئی انہونی یا غیر فطری حرکت کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

انہوں نے اردگرد کے فلیٹ پر نظر دوڑائی لیکن سب دروازے بند تھے۔ گہری خاموشی تھی اور کہیں سے ذرا سی آہٹ کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔

انہوں نے بلڈنگ کی لابی کا چکر لگایا۔ اردگرد کی سن گن لینے کی کوشش کی لیکن انہیں کامیابی نہ ہوسکی۔

فاطمہ پچھلے دو سال سے بسیرا اپارٹمنٹ کے فلیٹ نمبر ٹو بی میں مقیم تھیں۔ ان کے شوہر سعودی عرب میں جاب کے سلسلے میں رہائش پذیر تھے۔ وہ ایک بیٹے اور دو بیٹیوں کے ساتھ اکیلی رہتی تھیں۔ بڑی ہی مردمار اور دھانسو قسم کی خاتون تھیں۔ ان دو سالوں میں یہ پہلا واقعہ تھا جو حیرت ناک ہونے کے ساتھ ساتھ خاصا پُراسرار بھی تھا۔

اور پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ رات کے کسی نہ کسی پہر ان کی آنکھ کھل

جاتی اور آنکھ کھلنے کا سبب وہی مخصوص نسوانی چیخ ٹھہرتی لیکن جب تک وہ جوتی پہن کر باہر کوریڈور میں نکلتیں خاموشی چھا جاتی۔

کرید تو انہیں خاصی لگ چکی تھی۔ لیکن ابھی تک وہ کوئی اندازہ قائم کرنے سے قاصر رہی تھیں۔ یہ مسئلہ ان کے لئے لاینحل ہی رہا تھا لیکن آج وہ تہیہ کئے ہوئے تھیں کہ وہ اس بات کا سراغ لگا کر ہی رہیں گی کہ چیخنے کی یہ آواز کہاں سے اور کیوں بلند ہوتی ہے.....؟ اس کا حقیقت سے کچھ تعلق ہے یا یہ صرف ان کا وہم ہے۔

اس چیخ کا پس منظر کوئی انسانی سرگرمی کا ہے یا وہ کسی آسیب کا شکار ہو چکی ہیں.....؟

☆☆☆

فاضل کے مقدر کھل گئے تھے۔ مریم اس کے لئے سونے کی چڑیا ثابت ہوئی تھی اور اس کی اچانک لگنے والی اس لاٹری نے اسے عالم کی یاد سے بھی نجات دلا دی تھی۔ اس نے اسے ڈھونڈنے کی قطعاً کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ مریم کو یہاں لائے اور عالم سے بچھڑے اسے دو مہینے ہو چکے تھے۔ ان دو مہینوں میں روز ہی کوئی نہ کوئی مہمان اس کے گھر ضرور آتا۔ اور اس نے دونوں ہاتھوں سے دولت سمیٹی تھی۔

سب سے پہلا گاہک جمشید روڈ کا ایک ڈیلر گلریز تھا جس نے مریم کو دیکھنے کے بعد اور فاضل کے منہ سے مریم کے بارے میں بے پناہ تعریفیں سننے کے بعد آسانی سے دو لاکھ روپے فاضل کے حوالے کر دیئے تھے۔

اور پھر گلریز ہی کے توسط سے دوسری رات شہر کی ایک اور معتبر شخصیت فاضل کے فلیٹ میں آن وارد ہوئی۔ فاضل بسیرا اپارٹمنٹ میں کرائے دار کی حیثیت سے رہتا تھا اور کچھ عرصے قبل ہی اس نے یہ فلیٹ ایک پراپرٹی ڈیلر کے توسط سے حاصل کیا تھا۔ لیکن وہ یہاں کم ہی رہتا تھا۔

ہفتے میں ایک آدھ دن ہی وہ یہاں قیام کر پاتا تھا۔ لیکن جب سے لکشمی دیوی اس پر مہربان ہوئی تھی، اور مریم کے روپ میں اس کے گھر آن پدھاری تھی وہ کہیں نہیں گیا تھا اور پچھلے دو مہینے سے مسلسل نوٹ جمع کر رہا تھا۔

مریم کی وجہ سے ان دو مہینوں میں اس کے پاس اتنی دولت جمع ہوگئی تھی جس کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا اور کوئی اور کام کر کے اتنی دولت جمع کرنے میں شاید اسے سالوں لگ جاتے۔

شروع شروع میں مریم نے شدید احتجاج کیا۔ واویلا مچانے کی کوشش بھی کی لیکن مکروہ صورت فاضل کے ظلم و ستم کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ شروع کے دو چار دن اس نے شدید مزاحمت کی۔

شور کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی چیخوں کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ اور پھر اس دن جب مریم کے ہاتھ پاؤں باندھ کر اور منہ میں کپڑا ٹھونس کر فاضل نے اس کے نرم و نازک وجود پر اندھا دھند کوڑے برسائے۔ وہ بن پانی کی مچھلی کی طرح تڑپتی رہ گئی۔ لیکن منہ میں کپڑا ٹھنسا ہونے کی وجہ سے اس کے حلق سے سوائے خرخراہٹوں کی آواز کے کچھ بھی برآمد نہیں ہوا۔

پھر شاید اس نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ اب ہر رات کے بعد وہ بے جان لاش کی طرح جہاں بیٹھی وہیں بیٹھی رہتی۔

فاضل نے کھانا دیا تو چپ کر کے کھا لیا۔ کوئی شور نہ احتجاج، نہ کچھ طلب کرتی نہ کچھ کہتی۔ بس کبھی کبھی اس کی آنکھیں ساون بھادوں بن جاتیں۔

آج دو مہینے کے بعد بھی ایک مالدار گاہک فاضل کے ہاتھ لگ گیا تھا۔ اور فاضل نے مریم کی شان میں ایسے ایسے قصیدے پڑھے کہ وہ فاضل کے ساتھ کھنچا چلا آیا تھا۔ فاضل نے حسب معمول اس کو فلیٹ میں داخل کیا اور خود لفٹ کے ذریعے نیچے آ گیا۔

چوکیدار کے پاس بیٹھ کر فاضل گپیں لگا رہا تھا کہ اچانک تیز سائرن کی آواز

سے وہ چونک اٹھا۔

ایک پولیس جیپ گیٹ پر آن رکی تھی۔ اور پولیس کے مستعد جوان اس میں سے چھلانگیں لگا کر باہر نکلے۔

''پولیس کے یہ فرض شناس جوان خودکار اسلحے سے پوری طرح لیس تھے۔ وہ دوڑتے ہوئے اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے۔

کچھ لفٹ میں داخل ہوگئے۔ کچھ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانے لگے۔ مین گیٹ پر بیٹھے ہونے کے باوجود لفٹ کی پیشانی پر روشن ہوتا پانچویں فلور کا ہندسہ فاضل کو بخوبی نظر آ گیا۔

''خان صاحب......! ہم سگریٹ لے کر ابھی آتا ہے۔'' پٹھان چوکیدار سے یہ کہنے کے بعد فاضل وہاں نہیں رکا تھا۔ اس کی چھٹی حس نے اسے آئندہ آنے والے حالات سے باخبر کر دیا تھا اور اس نے پتلی گلی کا راستہ پکڑنا ہی بہتر سمجھا۔

اس کے اکاؤنٹ میں بہت سی رقم جمع ہو چکی تھی اور اب اسے اس فلیٹ یا دولت کمانے کی کسی مشین کی ضرورت نہیں تھی۔

پھر پٹھان چوکیدار کے سامنے تھوڑی ہی دیر کے بعد پولیس کے جوان واپس نمودار ہوئے۔

بکھرے بال اور زرد رنگت والی مریم اور ایک موٹی توند والا پختہ عمر کا آدمی ان کے نرغے میں تھا۔ پولیس کے جوانوں نے بڑی بے دردی سے دھکے مار کر انہیں گاڑی میں ڈالا اور گاڑی زن کی آواز کے ساتھ روانہ ہوگئی۔

پٹھان چوکیدار دم بخود کھڑا تھا۔ ٹھیک اسی وقت اندرونی طرف سے فاطمہ برآمد ہوئیں اور چوکیدار سے مخاطب ہوئیں۔

''اے ہے...... وہ موا منحوس شکل کہاں غائب ہوگیا......؟''

''کون منحوس شکل بی بی جی......!'' چوکیدار نے استفہامی انداز میں فاطمہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اے...... وہی سڑی شکل والا...... ٹوپی والا......!''

''اچھا وہ...... وہ تو ابھی سگریٹ لینے گیا تھا۔''

''بچ گیا کمینہ......! اب وہ کہاں آئے گا......؟ میں تو پہلے ہی کتنے دنوں سے اس کی تاک میں تھی لیکن اس کے مقدر ہی اچھے تھے جو وہ بھاگ نکلا۔''

''ہوا کیا بی بی جی......!'' چوکیدار ابھی تک حیرت کے جھٹکے سے نکل نہیں سکا تھا اور شاید معاملہ بھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''وہ بی بی تو بڑی معصوم صورت تھی اس کو بھی پولیس والے لے گئے۔ شاید فاضل صاحب کی بیوی تھی۔''چوکیدار نے اپنا اندازہ ظاہر کرتے ہوئے مزید کہا۔

''اسے جھاڑو پھرے منحوس کی شکل پر...... بڑی گھنی تھی وہ...... اس کی شکل پر نہ جاؤ۔ لچھن صحیح نہیں تھے اس کے...... شکل سے بھولی بھالی نظر آنے والی لیکن حرکتیں ایسی...... توبہ توبہ......! ہر روز کوئی نہ کوئی نیا آدمی آتا وہاں پر...... میں تو پچھلے دو مہینے سے پریشان تھی۔ شروع میں تو کئی دن تک مجھے اندازہ ہی نہیں ہوا کہ معاملہ کیا ہے لیکن تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں خان صاحب......! یہاں شریف لوگ رہتے ہیں۔ میرے گھر میں بھی دو دو جوان بچیاں ہیں، میں یہ گندگی یہاں کیسے برداشت کر سکتی تھی......؟ کئی دن باقاعدہ تجزیہ کیا ہے میں نے اور میں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی تو اٹھایا فون اور ملا دیا تھانے، سب کچھ بتا دیا میں نے۔

جھاڑو پھرے ان کم بختوں پر پوری عمارت ناپاک کر دی۔ آج تک یہاں ایسی کوئی بات دیکھی نہ سنی۔ پتا نہیں کلموہی کہاں سے آن مری تھی۔

خس کم جہاں پاک......''

فاطمہ نے ہاتھ جھاڑے اور واپس اندرونی حصے کی طرف بڑھ گئیں۔ پٹھان چوکیدار حیرت سے منہ کھولے ہکا بکا کھڑا تھا۔

☆☆☆

مریم نے چپ سادھ لی تھی۔ تفتیشی آفیسر کے کسی بھی سوال کا جواب نہ

دینے کی شاید اس نے قسم کھا لی تھی اور جواب دیتی بھی تو کیا......؟ کوئی جواب دینا تو درکنار وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل بھی نہ رہی تھی۔

''جرم محبت'' کی ایسی گھناؤنی سزا تو اس کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ آخر جرم ہی کیا تھا اس کا......؟ محبت ہی تو کی تھی اس نے......لیکن وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

ہر کہانی خوشگوار انجام نہیں رکھتی۔ لڑکیاں جذبات کی رو میں بہک کر محبت تو کر بیٹھتی ہیں لیکن یہ نہیں جانتیں کہ بعض اوقات یہ ہی محبت انہیں کن راستوں پر لے جائے گی۔

اور ظاہر سی بات ہے اس نے راستہ بھی تو غلط چنا تھا۔ تین جوان بھائیوں کے سر شرم سے جھکا دیئے تھے اس نے۔ بوڑھے والد کی عزت و ناموس کا جنازہ نکال دیا تھا۔ گھر کی دہلیز پھلانک کر ماں کی ممتا کو خون کے آنسو رلا دیا تھا اس نے۔ پھر خوشیاں اس کا مقدر ٹھہرتیں بھی تو کیسے......؟ بس وہ یہی کر سکتی تھی کہ چپ کی چادر اوڑھے اور ان کی رہی سہی عزت پر دھبا نہ لگنے دے اور اس نے ایسا ہی کیا۔

حدود آرڈیننس کے تحت اس کے خلاف ایف آئی آر درج کی گئی اور پھر ''دھندہ'' کرنے کے الزام میں اسے جیل بھجوا دیا گیا۔

آج جیل کی چار دیواری میں قید مریم سلاخوں کو پکڑے پریشانی کے عالم میں کھڑی سوچ رہی تھی کہ کیا محبت کا یہی انجام ہوتا ہے۔

ٹھیک اسی لمحے تیز ہوا کے جھونکے کے ساتھ اڑتا ہوا پرانا سا اخبار کا ایک ٹکڑا اس کے چہرے کے عین سامنے سلاخوں سے آ ٹکرایا اور پھر ہوا کے دباؤ کی وجہ سے وہیں چپکا پھڑ پھڑانے لگا۔

مریم کی ایک نظر اخبار پر پڑی اور اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اس نے جھپٹ کر اخبار کا وہ ٹکڑا کھینچ لیا۔

کاغذ پر شہروز کی تصویر تھی۔ اس نے جلدی جلدی ساتھ لکھی ہوئی تحریر پر نظریں دوڑائیں۔

''نامعلوم افراد کی فائرنگ سے نوجوان جاں بحق......!''

سرخی کے بعد تفصیلات میں لکھا ہوا تھا کہ

''کینٹ روڈ پر نامعلوم افراد کی فائرنگ سے نوجوان ہلاک ہوگیا جس کی شناخت نہیں ہوسکی۔ امکان ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ ڈکیتی کی واردات تھی اور نوجوان سے نامعلوم افراد کچھ رقم وغیرہ چھین کر لے جانا چاہتے تھے لیکن نوجوان کی مزاحمت کی وجہ سے فائرنگ کر کے اسے ہلاک کر گئے۔ پولیس نے مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی۔''

دور جیل میں کسی قیدی خاتون کی آواز بلند ہو رہی ہے۔

جناں مینوں تو ستایا
کوئی تینوں وی ستاوے
اللہ کرے تیری کسی نال
اکھ لڑ جاوے

☆☆☆

پاکستان ورچوئل لائبریری ڈاٹ کام

فعل شنیع

''ٹھک ٹھک......!'' دستک کی آواز بلند ہوئی تو ایک لمحے کی خاموشی کے بعد ایک دلکش نسوانی آواز سنائی دی۔

''کون......؟''

''کوریئر سروس......!'' جواباً ایک مردانہ آواز بلند ہوئی اور دروازہ بے آواز کھلتا چلا گیا۔

دروازے کی اوٹ سے جو حسین سراپا نمودار ہوا وہ اپنی آواز ہی کی طرح خوب صورت تھا۔ پارسل ہاتھ میں اٹھائے شاہان کی نظریں اس کے ملکوتی چہرے سے ٹکرائیں تو وہیں جمی رہ گئیں۔

ایک طویل عرصے سے وہ ایک پرائیویٹ کوریئر سروس میں ملازمت کر رہا تھا۔ ڈور ٹو ڈور ڈاک کی ترسیل اس کے فرائض میں شامل تھی۔ بھانت بھانت کے لوگ اور طرح طرح کے چہرے دیکھنے میں آتے تھے لیکن آج کچھ ایسا ہوا تھا کہ اسے اپنے آپ پر جیسے قابو ہی نہ رہا تھا۔

ایسا ہی دلکش اور مسحور کن چہرہ تھا جس نے اس کے دل میں اتھل پتھل مچا دی تھی۔ وہ بے خودی کے عالم میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہی دیکھتا رہ گیا۔ نمودار ہونے والے وجود نے شاید اس کی گستاخ نظروں کی بے باکی کا انداز

لگا لیا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے آپ کو سمیٹنے کی کوشش کرتے ہوئے دوپٹے کا زاویہ درست کیا اور بولی۔

''جی فرمایئے......!'' اور شاہان چونک کر واپس آ گیا۔ بالکل یوں جیسے اس کے پاتال میں گرتے ہوئے وجود کو کسی نے بالوں سے پکڑ کر یک لخت زمین پر پٹخ دیا ہو۔ وہ ہڑبڑا کر بولا۔

''جج...... جی......! وہ آپ کا کوریئر ہے۔ میڈم نیناں بصیر آپ ہی ہیں......؟'' جملے کے اختتام تک اس کا انداز استفہامیہ ہو گیا تھا۔

''جی......! میں ہی ہوں۔ فرمایئے......!'' اور شاہان نے بادل ناخواستہ خوب صورت پیکنگ والا وہ پارسل اس کی طرف بڑھا دیا۔ نیناں نے ہاتھ بڑھا کر پارسل وصول کیا تو اس کا ہاتھ شاہان کے ہاتھ سے مس ہو گیا۔ اس نے جلدی سے پارسل جھپٹتے ہوئے اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ لیکن شاہان کے پورے وجود کو جیسے ہائی وولٹیج کا الیکٹرک شاک لگا تھا اور وہ اپنی اس کیفیت پر سٹپٹا کر رہ گیا۔

اس نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی اور دل ہی دل میں خود کو صلواتیں سناتے ہوئے رسیونگ سلپ اس کی جانب بڑھائی۔

''سگنیچر پلیز......!'' نیناں نے ہاتھ آگے بڑھا کر سلپ تھامی اور پھر سوالیہ نظروں سے شاہان کی طرف دیکھا تو شاہان نے اس کا مدعا سمجھتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں موجود بال پوائنٹ اس کی جانب بڑھا دیا۔

نیناں نے سلپ سر نظریں جمائے بے خیالی میں ہاتھ آگے بڑھایا تو اس کے نتیجے میں شاہان کو ہائی وولٹیج کا ایک مزید الیکٹرک شاک برداشت کرنا پڑا۔ نیناں نے جلدی سے بال پوائنٹ پکڑا اور سٹپٹاتے ہوئے ہاتھ واپس کر لیا۔ اس دوران ایک لمحے کے لئے دونوں کی نظریں آپس میں ٹکرائیں تو شاہان کا دل جیسے پسلیاں توڑ کر باہر آنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں چھپا معذرت خواہانہ انداز اسے بہت بھلا لگا تھا۔

ٹھیک اسی وقت اندرونی سمت سے ایک ہلکے سے دھماکے کی آواز سنائی دی بالکل یوں جیسے کوئی چیز اونچائی سے گری ہو۔ اس کے ساتھ ہی زوردار چیخوں کی صدا بلند ہونے لگی۔ یہ نان اسٹاپ آواز یقیناً کسی بچے کے حلق سے برآمد ہو رہی تھی۔ ریسیونگ سلپ اور بال پوائنٹ نیناں کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے جا گرا اور اس کے حلق سے بھی ایک سریلی چیخ برآمد ہوئی۔

''ہائے میری بچی......!'' اور پھر بدحواسی کے انداز میں ماں غڑاپ سے دروازے کی اندرونی سمت غائب ہوگئی۔ شاہان ہچکچاہٹ آمیز انداز میں چند لمحے کھڑا سوچتا رہا۔ اندر سے کسی چیز کے گرنے کی آواز پھر کسی بچے کی بے ساختہ چیخیں اور ہائے میری بچی کا نعرہ جہاں اس حقیقت کی تصدیق کر گیا تھا کہ رونے والا بچہ نہیں بچی ہے وہاں کسی اچانک حادثے کی طرف اشارہ بھی تھا۔

''ہائے میری بچی......!'' کا یہ مختصر نعرہ ایک ماں کی ممتا اور اپنی بچی کے لئے بے پایاں محبت کا اظہار تو ضرور تھا لیکن شاہان کے دل میں کئی شیش محلوں کے چھناکے سے ٹوٹ جانے کا سبب بھی تھا۔

حسن و خوب صورتی کا وہ مجسمہ اکیلا نہیں تھا بلکہ وہ کم از کم ایک بچی کی ماں تو ضرور تھی اور یہ بات شاہان کے لئے کسی سانحے سے کم نہ تھی۔ ایک مرتبہ جی میں آئی کہ چپ چاپ چلا جائے لیکن کم بخت دل اس کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ دل اس کا تھا لیکن دھڑکنیں کسی اور کی اسیر تھیں۔

چند لمحے وہ اپنے آپ سے نبرد آزما رہا لیکن پھر دل نے دماغ کو شکست دے دی اور اس کے قدم بے ساختہ اندرونی سمت اٹھتے چلے گئے۔

☆☆☆

''ٹرن...... ٹرن......!'' ٹیلی فون بزر چلایا اور پھر ایک خوب صورت نسوانی ہاتھ نے ریسیور اٹھا لیا۔

''ہیپی ویڈنگ اینورسری نیناں ڈارلنگ......!'' دوسری جانب سے ایک محبت

بھری مردانہ آواز سنائی دی اور نیناں نے ایک ادا کے ساتھ ماتھے پر بکھر جانے والی زلفوں کی ایک شریر لٹ کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''بس رہنے دو...... سارے دن کے بعد اب فرصت ملی ہے تمہیں......؟''

''اوہو...... ! نیناں ڈارلنگ...... ! تمہیں پتا ہے پردیس میں رہنا کتنا مشکل کام ہے......؟ سارا دن بیل کی طرح کام کرنا پڑتا ہے۔ جیسے ہی کام سے فارغ ہوا بھاگا بھاگا اپنے اپارٹمنٹ پہنچا ہوں اور فوراً تمہیں کال کر رہا ہوں۔ پتا ہے آج کے دن میں تمہیں کتنا مس کر رہا ہوں۔''

''ساری لفظوں کی جادوگری ہے۔ اگر مجھے اتنا ہی مس کرتے تو کیا ان چار سالوں میں ایک چکر بھی پاکستان کا نہیں لگا سکتے تھے......؟''

''جان...... ! تمہیں تو پتا ہے کہ پاکستان میں جاب کتنی مشکل سے ملتی ہے۔ کتنے عرصہ دفتروں کے چکر کاٹتا رہا، جوتیاں چٹخاتا رہا لیکن اپنی جان کے لئے کچھ نہ کر پایا۔ تمہارے اور علیزہ کے لئے ہی تو میں نے یہ قدم اٹھایا تھا۔ غیر قانونی طریقے سے جان ہتھیلی پہ رکھ کر دوبئی پہنچا ہوں جو کچھ کر رہا ہوں تمہارے لئے ہی تو کر رہا ہوں اور تم آج بھی دل جلانے والی باتیں کر رہی ہو۔ آج تو ہماری شادی کی سالگرہ ہے۔ کیا تمہیں میرا بھیجا ہوا گفٹ نہیں ملا......؟''

''ہاں ہاں...... ! مل گیا گفٹ...... لیکن کب تک ان بے جان چیزوں سے دل بہلاؤں......؟ شادی میں نے ان بے جان چیزوں سے نہیں، تم سے کی ہے۔ ہر سال گفٹ بھیج دیتے ہو لیکن یہ بھی تو سوچو کہ ان چار سالوں میں میں تمہاری شکل تک نہیں دیکھ پائی۔''

''نیناں ڈارلنگ...... ! تمہاری ہر بات درست ہے لیکن جب میں تمہارے ساتھ تھا تب تم انہی بے جان چیزوں کے لئے مجھ سے جھگڑا کرتی تھیں اور اب جب میں نے تمہارے لئے ان چیزوں کے انبار لگا دیئے ہیں تو اب تم میرے لئے تڑپ رہی ہو۔

سچ میں انسان کتنا خودغرض ہے کسی حال میں بھی خوش نہیں رہ سکتا۔ اللہ کی بندی......! میں یہاں کوئی عیش نہیں کر رہا۔ دن رات شدید محنت کرتا ہوں۔ اپنا پسینہ بہا کر اس کے بدلے تمہارے لئے آسائشیں خریدتا ہوں۔ یہ بھی تو سوچو کہ جدائی کی یہ سزا میں بھی تو کاٹ رہا ہوں۔"

"میں کچھ نہیں جانتی...... مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ راتوں کی یہ تنہائی اور سونا بستر میری جان لے لے گا۔ یہ ٹھیک ہے کہ ساری آسائشیں تم نے فراہم کر دی ہیں لیکن ایک تنہا عورت صرف ایک معصوم بچی کے ساتھ زندگی کیسے کاٹ سکتی ہے......؟ تصور کرو...... میں تھک گئی ہوں، پتا ہے آج علیزہ کو کرنٹ لگ گیا تھا۔ میں اسے کس طرح اسپتال لے گئی، کس طرح میں نے خود کو اور بچی کو سنبھالا، یہ میں ہی جانتی ہوں۔ اگر تمہارا واپسی کا ارادہ نہیں بنتا تو اپنے اس تحفے کو بھی وہیں منگوا لو۔ میں کہاں تک اس کا خیال رکھوں......؟ تمہارا بھیجا ہوا گفٹ وصول کرنے دروازے تک گئی تھی تو اس نے کرنٹ لگوا لیا۔ ایک دن چھری سے ہاتھ کاٹ لیا تھا۔ کسی کروٹ چین نہیں، تمہاری بیٹی ہے نا...... تم پر ہی گئی ہے۔"

"دیکھو نیناں......! فضول باتیں نہیں کرو...... تم ماں ہو اس کی...... میں اتنی دور پردیس میں تمہارے اور علیزہ کی یاد کے سہارے وقت گزار رہا ہوں۔ فون کرتا ہوں تم سے محبت بھری باتیں کرنے کے لئے لیکن تم فون پر بھی جلی کٹی سنانے بیٹھ جاتی ہو۔ پتا نہیں کیوں تم شروع دن سے میرے ساتھ یہی سلوک کر رہی ہو۔ کاش جتنی خوب صورت تم خود ہو اتنی ہی خوب صورت تمہاری سیرت بھی ہوتی۔"

"ہاں ہاں......! میں تو ہوں ہی بدسیرت...... تیزاب پھینک دو میرے چہرے پر تاکہ صورت بھی ویسی ہی ہو جائے۔ جلن ہوتی ہے نا میری خوب صورتی سے......؟"

"اللہ تمہیں عقل دے نیناں......! لیکن مجھے یقین ہے کہ ایسا ہوگا نہیں۔ میرے ہی مقدر پھوٹے تھے جو میں نے تم سے شادی کی۔ واہ بصیر چوہان......!

تمہیں بھی پوری دنیا میں اور کوئی نہیں ملی۔'' اس نے سخت غصے کے عالم میں ریسیور کریڈل پر پٹخ دیا اور لائن بے جان ہوگئی۔

نیناں نے ایک نظر ریسیور کو گھورا اور پھر اس نے بھی ایک دھماکے سے ریسیور واپس پٹخ دیا۔

☆☆☆

جونہی وہ اندرونی کمرے میں داخل ہوا اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ بچی ساکت ہو چکی تھی اور دیوار پر موجود الیکٹرک بورڈ کے قریب بے سدھ پڑی تھی۔ جبکہ دیوار پر موجود الیکٹرک بورڈ کی ساکٹ میں شو کی جگہ ایک اسٹیل کا چمچہ پھنسا ہوا نظر آ رہا تھا۔

شاہان کو ایک ہی نظر میں اندازہ ہو گیا کہ ہوا کیا ہے......؟ نیناں بچی کا سر گود میں رکھے زار و قطار رو رہی تھی اور اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں آنسو دیکھ کر شاہان تڑپ کر رہ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھا اور بولا۔

''معافی چاہتا ہوں میڈم......! لیکن بچی کی چیخیں سن کر میں خود کو روک نہیں پایا۔ بچی کو الیکٹرک شاک لگا ہے آپ بیٹھئے میں دیکھتا ہوں۔'' اور نیناں آہستہ سے بچی کو خود سے الگ کرتے ہوئے ایک سائیڈ پر ہٹ گئی۔ شاہان نے جلدی سے بچی کی نبض چیک کی جو بڑی سست روی سے چل رہی تھی۔

''اسے فوراً ہسپتال لے جانا پڑے گا۔'' اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد شاہان کی موٹر سائیکل فراٹے بھرتی ہوئی ہاسپٹل کی سمت اڑی چلی جا رہی تھی۔

نیناں بچی کو گود میں لئے اس کے ہمراہ تھی۔ دو تین گھنٹے کی مصروفیت کے بعد جب شاہان واپس نیناں کے ساتھ اس کے گھر پہنچا تو بچی مکمل طور پر ہوش میں تھی اور اس کی حالت بھی کافی حد تک بہتر تھی۔

''میں کس طرح سے آپ کا شکریہ ادا کروں......؟ اگر آج آپ نہ ہوتے تو پتا نہیں کیا ہو جاتا......؟'' نیناں نے تشکر آمیز نگاہوں سے شاہان کی جانب دیکھتے

ہوئے کہا۔

''شکریے کی کوئی ضرورت نہیں...... انسانیت کے ناطے یہ میرا فرض تھا ویسے اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات پوچھوں......؟''

''جی ضرور......!'' نیناں نے استفہامیہ انداز میں شاہان کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''آپ یہاں اکیلی رہتی ہیں...... میرا مطلب ہے کہ آپ کے شوہر یا دوسرے فیملی ممبرز......؟'' نیناں نے ایک سرد آہ بھری اور بولی۔

''علیزہ کے علاوہ میرا اور کوئی سہارا نہیں اور بصیر دوبئ میں ہوتے ہیں پچھلے چار سال میں انہوں نے پلٹ کر دیکھا تک نہیں کہ ہم لوگ زندہ بھی ہیں یا مر گئے۔''

''اوہ...... ویری سیڈ......!'' نیناں کے مختصر جواب نے شاہان کو آزردہ کر دیا۔ اتنی خوب صورت لڑکی اور پھر اتنی معصوم اتنی پیاری بچی...... شاہان کو اس شخص کی بدقسمتی پر ترس آیا جو انہیں چھوڑ کر دوبئ جا بیٹھا تھا اور یہی بات شاہان کے لبوں پر بھی آ گئی۔ نیناں نے چونک کر اسے دیکھا اور پھر دیکھتی ہی رہ گئی۔

اس نے پہلی مرتبہ شاہان کی پرسنالٹی پر غور کیا تھا۔ تیکھے نقوش اور اونچے لمبے قد کا مالک شاہان مردانہ وجاہت کا شاہکار تھا اور ایک اس کا شوہر تھا جس کی شکل تھی نہ صورت، پانچ فٹ قد، سیاہ رنگت پر پھولا ہوا جسم۔

اچانک ہی اس کے اندر ایک سرکش سی لہر اٹھی جو اپنے ساتھ بہت کچھ بہا لے گئی۔ اس کی سوچ کا انداز تبدیل ہو چکا تھا اور اب وہ گہری نظروں سے شاہان کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ اس کی نسوانی حیات نے اس پر چند لمحوں میں ہی یہ راز آشکار کر دیا کہ شاہان کی نظروں میں اس کے لئے پسندیدگی کے جذبات ہیں اور اس کا آج کا یہ اقدام صرف انسانی ہمدردی کے ناطے نہیں تھا۔

''میڈم......! آپ ناراض نہ ہوں...... تو کیا میں بچی کا پتا کرنے دوبارہ

حاضر ہو سکتا ہوں......؟'' شاہان نے قدرے ہچکچاہٹ آمیز انداز میں دریافت کیا اور نیناں کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیل گئی۔

''صرف بچی کا نہیں آپ میرا پتا کرنے بھی آ سکتے ہیں۔'' اور شاہان بھونچکا رہ گیا۔ اسے شاید اتنی جلدی نیناں سے اس بے باکی کی توقع نہ تھی۔ بہر حال جو بھی تھا...... اندھا کیا چاہے دو آنکھیں......؟ اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے اور وہ خوشی سے سرشار ہو گیا۔

☆☆☆

''تم یہ گھر چھوڑ دو......!'' شاہان نے کہا۔

''اگر گھر چھوڑ دوں تو پھر کیا کریں گے......؟ میں رہوں گی کہاں......؟'' نیناں نے بے اختیار سوال کیا۔

''وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو...... میں سارا انتظام کر لوں گا۔'' شاہان نے پُراعتماد انداز میں جواب دیا۔

بچی کو کرنٹ لگنے کے اس چھوٹے سے حادثے نے دونوں کو بہت قریب کر دیا تھا۔ شاہان بلا ناغہ بے دھڑک یہاں آتا تھا۔

شروع شروع میں تو صرف دن کے وقت ہی اس کے چکر لگا کرتے تھے لیکن پھر اکثر اوقات وہ رات میں بھی یہیں رکنے لگا تھا۔ دونوں کسی ان دیکھی قوت کے تحت آگے ہی آگے بڑھتے چلے گئے تھے اور اب وہ اتنا آگے بڑھ چکے تھے کہ واپسی کے بارے میں سوچنا بھی محال تھا۔

شاہان اکثر نیناں اور علیزہ کو اپنی موٹر سائیکل پر آؤٹنگ کے لئے لے جاتا تھا۔ کئی مرتبہ باہر کھانا کھاتے اور اکثر اوقات پارکوں کی سیر کی جاتی۔ دونوں ایک دوسرے میں اتنا گم ہو گئے کہ انہیں اور کچھ نظر ہی نہیں آتا تھا اور اردگرد کا ہوش ہی نہ تھا لیکن...... ''تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں'' اور اس طرح کی باتیں تو ویسے بھی زیادہ عرصہ چھپی نہیں رہ سکتیں۔ سو یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے

آواز خالہ پروین نے اٹھائی۔ انہوں نے نجمہ سے کہا۔

''ہائے ہائے......! لچھن تو دیکھو مہارانی کے......شوہر بے چارہ پردیس میں دھکے کھا رہا ہے اور یہ یہاں گل چھرے اڑا رہی ہے۔ وہ موا مسٹنڈا سارا سارا دن پھٹ پھٹی پے لئے لئے گھومتا ہے اور راجکماری یوں اس کے گلے میں بانہیں ڈالے پھرتی ہے جیسے اس کی بیوی ہو...... پتا نہیں کون نامراد ہے......توبہ توبہ......! کیا زمانہ آ گیا ہے......؟''

اور پھر اسی طرح کی چہ میگوئیاں ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری زبان پر گردش کرتی پورے علاقے میں پھیل گئیں اور یہی نہیں...... بات مردوں سے بھی چھپی نہ رہ سکی اور پھر وہ مرزا توقیر بیگ ہی تھے جنہوں نے بصیر چوہان کا نمبر ڈائل کیا اور تمام حالات و واقعات دوبئی تک منتقل کر دیئے۔

اس رات نیناں نے بصیر کی کال موصول کی تو وہ سخت غصے میں تھا۔ اس نے نیناں کی ٹھیک ٹھاک کلاس لی اور اسے بہت سخت سست کہا لیکن نیناں شرمندہ ہونے کی بجائے مزید بپھر گئی اور جنونی انداز میں بولی۔

''مجھے تم سے طلاق چاہئے بصیر......! اگر تم جان ہی چکے ہو تو یہ بھی جان لو کہ اب میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ تمہیں تمہارا دوبئی مبارک......! مجھے طلاق کے کاغذ بھجوا دو۔''

بصیر نیناں کی بات سن کر سخت طیش میں آ گیا اور اس کے منہ سے مغلظات کا طوفان اُمڈ پڑا لیکن سننے والا کون تھا......؟ نیناں نے تو ریسیور دیوار پر دے مارا تھا اور اب یہی سب کچھ اس نے شاہان کو کہہ سنایا تھا جس کے جواب میں شاہان نے اسے گھر چھوڑنے کا مشورہ دیا تھا۔

''میرے پاس گھر بھی ہے اور ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء بھی......لیکن میرا گھر سونا پڑا ہوا ہے۔ کیونکہ تمہاری طرح میں بھی اس دنیا میں تنہا ہوں۔ والدین ٹرین کے ایک حادثے میں وفات پا چکے ہیں چونکہ اکلوتا تھا اس لئے تب

سے اب تک اکیلا ہوں اور یہ اکیلا پن مجھے اپنی ذات کے ادھورا ہونے کا احساس دلاتا تھا لیکن اب مجھے تمہارا ساتھ مل گیا ہے۔ اب میں اکیلا نہیں رہا، میں ادھورا نہیں رہا۔ تمہیں پا کر میں مکمل ہوگیا ہوں نیناں......!''

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو

''اگر تم تیار ہو تو میرا گھر حاضر ہے۔'' شاہان نے جذباتی انداز میں کہا اور پھر کچھ دیر کی بحث و تکرار کے بعد نیناں بھی شاہان کے خیال سے متفق ہوگئی اور پھر وہ دونوں اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کے بارے میں تمام پہلوؤں پر تبادلہ خیال کرنے لگے۔

☆☆☆

بصیر کا برا حال تھا۔ کبھی وہ طیش میں آجاتا تو کبھی سخت افسردہ و رنجیدہ ہو جاتا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر واپس پاکستان پہنچ جائے۔ نیناں کی تلخ گوئی جہاں اس کے ذہن و دل پر ہتھوڑے برسا رہی تھی وہیں اس کی بے وفائی نے اسے توڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ نیناں سے شدید محبت کرتا تھا اور علیزہ میں تو اس کی جان تھی۔ لیکن نامساعد حالات اور فاقہ کشی کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ ان سے علیحدگی پر تیار ہوگیا تھا اور پھر بڑی مشکلوں کے بعد کسی نہ کسی طرح دوبئی آن پہنچا تھا اور یہاں آ کر بھی وہ بیوی اور بیٹی کو ایک لمحے کے لئے بھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔

سوتے وقت بیوی کی شبیہ آنکھوں کے سامنے ہوتی تو کام کرتے ہوئے ننھی علیزہ کی قلقاریاں اس کی سماعتوں میں گونجتی رہتی تھیں۔

اس نے دن رات محنت اور مشقت کر کے حالات کو شکست دی تھی۔ وہ اپنی بیٹی اور اپنی بیوی کی عسرت زدہ زندگی کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ وہ غربت سے تو نکل آیا تھا لیکن اس مصیبت سے کیسے نکل پائے گا جو اچانک اس کے سر آن پڑی تھی۔ اس کا اسے کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ حالات کو تو

اس نے شکست دے دی تھی لیکن اپنی تقدیر سے کیسے لڑتا......؟ یہ اس کے بس میں نہیں تھا لیکن وہ اپنے گھر کو جلتا ہوا انہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ اپنے گھر کو ٹوٹنے سے بچانا چاہتا تھا۔

نیناں کے باغیانہ الفاظ اس کے کانوں میں زہر گھول رہے تھے لیکن وہ پھر بھی اس کے پاس پہنچنا چاہتا تھا، اسے سمجھانا چاہتا تھا لیکن اس کا ذریعہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ فون تو اس دن کے بعد سے اسے ہمیشہ ڈیڈ ہی ملا تھا اور واپس پہنچنے کے لئے اسے گرفتاری دینا پڑتی کیونکہ وہ ناجائز طریقے سے دوبئی پہنچا تھا اور دوبئی میں غیر قانونی طریقے سے رہنے والے لوگ جب واپس پاکستان جانا چاہتے تھے تو خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیتے پھر پندرہ سے بیس دن انہیں جیل میں گزارنا پڑتے اور پھر انہیں حکومت کی طرف سے سرکاری خرچے پر بائی ایئر ڈی پورٹ کر دیا جاتا لیکن وہ اتنے دن گزارنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کا تو ایک ایک لمحہ مشکل سے گزر رہا تھا۔ وہ پل پل انگاروں پہ لوٹ رہا تھا۔ وہ یہ رسک نہیں لے سکتا تھا۔ وہ تو اڑ کر پاکستان پہنچ جانا چاہتا تھا۔ پھر وہ گرفتاری کیونکر دیتا۔

سوچوں کا ایک بحر بے کراں تھا جس میں وہ کسی تنکے کی طرح ڈوبتا ابھرتا رہا۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہ آئی۔ اس نے ریموٹ اٹھا کر اضطراری انداز میں ٹی وی آن کر دیا۔

اُردو چینل تھا جس پر کئی گلوکار ایک خوب صورت غزل پیش کر رہا تھا۔

مجھ کو مری حیات سے باہر نکال کر
تم کو ملا ہے کیا مجھے مشکل میں ڈال کر
تم سے بچھڑ کے میں کہیں اچھی گزارتا
کیا پا لیا ہے آج ان زخموں کو پال کر

غزل کے بول سن کر اس کے دل کے تار جھنجنا اٹھے۔ اسے یوں لگا کہ شاید

شاعر نے اسی کے جذبات کی عکاسی کی ہے۔ گلوکار نے بھی خوب دل لگا کر تان اٹھائی۔

دے کر دکھوں کے پھول اور تمغہ جدائی کا
تاکید کر رہے ہیں کہ رکھنا سنبھال کر

اس کے دل میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور آنکھوں کے سامنے ایک جالا سا تن گیا۔ اب وہ پوری طرح غزل کے الفاظ اور گلوکار کی سحر انگیز آواز میں گم ہو چکا تھا۔

ٹھوکر لگی ہے اس طرح سنبھلا نہ جا سکا
اے دوست میرے پھر کوئی ایسا کمال کر
مانا کہ ہم سے درد کا رشتہ نہیں رہا
کیوں جا رہے ہو اس طرح یوں ہم کو ٹال کر

اور اس کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا۔ اس کے تخیل کے پردوں میں نیناں کی خوب صورت شکل نمودار ہوگئی جو اس سے ہاتھ چھڑا کر اس سے کہیں دور جا رہی تھی اور ننھی علیزہ ماں کا پلو پکڑے روتی بلکتی اس کے پیچھے پیچھے چلی جا رہی تھی۔

اس کا گھر اس کی گرہستی پر جیسے بجلی گر گئی تھی اور آن کی آن میں سب کچھ جل کر خاک ہوگیا تھا۔ ادھر گلوکار کی آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔

ہم کو ملا کے خاک میں خوش ہوگئے ہیں وہ
جو چل رہے ہیں خاک پر دامن سنبھال کر

اس ے حلق میں جیسے کانٹے اتر آئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بے آب و گیاہ صحرا میں تنہا کھڑا ہو اور سورج آگ برسا رہا ہو۔ اسے شدید پیاس محسوس ہوئی اس نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں اور سائیڈ ٹیبل پر سے گلاس اٹھانے کی کوشش کی لیکن گلاس اس کے ہاتھ سے ٹکرا کر فرش پر آرہا اور کرچی کرچی ہوگیا۔

اسی وقت گلوکار نے غزل کا مقطع کہا۔

ہمدم کسی کی یاد نے بے حال کر دیا
اب کیا کریں گے ہم کوئی ساغر اچھال کر

بصیر نے غصیلے انداز میں ٹی وی آف کیا اور ریموٹ دیوار پر کھینچ مارا۔

☆☆☆

نیناں اور شاہان ایک دوسرے میں گم تھے۔ شاہان کے گھر شفٹ ہوئے آج نیناں کو تیسرا دن تھا اور اس کے دل میں کسی قسم کا کوئی پچھتاوا یا ملال ہرگز نہیں تھا۔ راوی چین ہی چین لکھتا تھا۔ لیکن آج اس پر سکوت سمندر میں تلاطم پیدا ہوگیا تھا اور پہلی بار نیناں کو ایک عجیب سا احساس ہوا۔

رات کے تقریباً ساڑھے گیارہ کا وقت تھا۔ دونوں آپس میں محبت بھری گفتگو کر رہے تھے کہ ساتھ والے کمرہ سے علیزہ کی زور زور سے رونے کی آواز بلند ہوئی اور ان تین دنوں میں ایسا پہلی مرتبہ نہیں ہوا تھا۔

علیزہ ہمیشہ رات کو نیناں سے لپٹ کر سوتی تھی۔ لیکن یہاں آکر نیناں اسے سلانے کے بعد شاہان کے کمرے میں آجاتی۔ جونہی علیزہ کی آنکھ کھلتی وہ رونے لگتی اور نیناں بھاگی بھاگی واپس علیزہ کے کمرے میں آجاتی۔ بہلا کر، پچکار کر اور علیزہ کے بالوں میں انگلیاں پھیر کر اسے سلاتی اور واپس شاہان کے کمرے میں چلی جاتی۔

بچی شاید اس نئے ماحول سے اور اس نئی تبدیلی سے ایڈجسٹ نہیں کر پا رہی تھی اور رات میں تین چار مرتبہ جاگ کر ضرور رونے لگتی۔ شاید وہ تنہائی سے ڈر جاتی تھی۔ نیناں جانتی تھی کہ آہستہ آہستہ وہ اس ماحول کی عادی ہو جائے گی۔ لیکن شاید شاہان کو نیناں کا رات کو اس طرح بار بار اٹھ کر علیزہ کے کمرے میں جانا اچھا نہیں لگتا تھا۔ کل بھی اس کے تاثرات کچھ خراب ہوئے تھے لیکن نیناں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال کر کہا۔

''چھوڑو نا جان......! بچی ہے۔ آہستہ آہستہ ایڈجسٹ کر لے گی۔ موڈ خراب نہ کریں۔'' اور شاہان مسکرا دیا تھا۔ لیکن آج تو حد ہوگئی تھی۔ نیناں علیزہ کو سلا کر واپس شاہان کے کمرے کی طرف گئی تو اس کا دروازہ اندر سے بند پایا اس نے آہستہ سے دروازہ تھپتھپایا لیکن جواب ندارد...... نیناں نے ذرا زور سے دروازہ بجایا تو شاہان کی تلخ آواز سنائی دی۔

''جاؤ...... اسی کے پاس...... بار بار اٹھ کر جانے کی زحمت سے تو بچ جاؤ گی۔''

''پلیز شاہان......! ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ...... بچی ہے وہ...... معصوم ہے، ناسمجھ...... میں نے اسے سلا دیا ہے۔'' نیناں نے ملتجیانہ انداز میں کہا۔

''تو کون سا مرگئی ہے، دوبارہ اٹھ جائے گی۔ جاؤ اسی کے پاس......!''

جواباً شاہان کی دھاڑ بلند ہوئی اور نیناں دھک سے رہ گئی۔ ٹھیک اسی لمحے علیزہ پھر زور زور سے رونے لگی۔

شاہان کی دھاڑ کافی بلند تھی جسے سن کر بچی شاید دوبارہ ڈر گئی تھی۔ چند لمحوں تک نیناں ساکت و جامد کھڑی دروازے کو تکتی رہ گئی۔ پھر ایک جھٹکے سے مڑ کر آندھی اور طوفان کی طرح علیزہ کے کمرے کی طرف لپکی اور پھر وہ ننھی علیزہ پر پل پڑی اور ننھی علیزہ کے پھول جیسے رخسار سرخ ہوگئے۔ نیناں جنونی انداز میں تھپڑوں سے علیزہ کو پیٹ رہی تھی اور ساتھ ساتھ چلاتی جا رہی تھی۔

''زندگی عذاب کر دی میری...... تم مر کیوں نہیں جاتیں......؟ کون سا سانپ نکل آتا ہے کمرے میں جو بار بار چیخنے لگتی ہو......؟'' اور ننھی علیزہ زور زور سے چلانے لگی۔ اسے شاید اپنی ماں سے ایسے سلوک کی توقع نہ تھی اور ایسا ہوا بھی تو پہلی مرتبہ تھا۔

اس کی چار سالہ زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ اس کے ساتھ یہ سلوک ہو

''چپ کرو...... آواز نہ نکلے تمہاری......!'' نیناں دھاڑ رہی تھی لیکن علیزہ کو اتنی سمجھ ہی کہاں تھی......؟ جب اس کا رونا بند نہیں ہوا تو تھک ہار کر نیناں بھی بستر پر گر گئی اور رونے لگی۔

بچی بہت دیر تک روتی، بسورتی رہی لیکن نیناں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

پھر پہلے علیزہ سوئی یا نیناں، اس کا اندازہ دونوں کو نہ ہوا۔

☆☆☆

بصیر کے ذہن میں اچانک ایک آئیڈیا آیا تھا اور پھر دھیرے دھیرے یہ خیال اس کے ذہن میں پختہ ہوتا چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اسے پاکستان جلدی پہنچنا ہے تو اس سے بہتر اور کوئی دوسرا طریقہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا اور جابر کا نمبر ڈائل کرنے لگا۔

چند لمحوں ے بعد ہی دوسری جانب سے جابر کی پھاڑ کھانے والی غراہٹ بلند ہوئی۔

''جابر ہیر......!''

''جابر بھائی......! میں بصیر بات کر رہا ہوں۔ آپ کے ہاں کام کرنے آیا تھا، پینٹ کا کام......!'' اور دوسری جانب چند لمحوں کے لئے خاموشی چھا گئی پھر شاید اسے پہچان لیا گیا تھا۔

''بصیر......! وہ پاکستانی......؟'' دوسری جانب سے پوچھا گیا۔

''جی جی......! جابر بھائی......! مجھے آپ سے ایک ضروری کام آن پڑا ہے۔ کیا میں حاضر ہو سکتا ہوں......؟'' بصیر نے اطمینان کی طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

''آجاؤ......!'' دوسری جانب سے جھٹکے دار لہجے میں جواب دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی لائن بے جان ہوگئی۔

جابر انڈین نژاد تھا اور دوبئ میں کئی ایسے دھندوں کی سرپرستی کر رہا تھا

جنہیں عرف عام میں دو نمبر کہا جاتا تھا۔ انتہائی اکھڑ مزاج اور ہاتھ چھٹ قسم کا بندہ تھا اور بصیر جو انتہا کا محنتی آدمی تھا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود اس نے محنت کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کی تھی اور دوبئی تو وہ آیا ہی اس لئے تھا کہ اسے پیسہ کمانا تھا...... بہت سارا پیسہ اور اس کے لئے اس نے یہاں آکر ہر وہ کام کیا تھا جس سے اس کا یہ مقصد پورا ہوتا تھا۔

اس نے مزدوری بھی کی تھی، ہیلپر بھی رہا تھا اور پینٹ کا کام بھی کیا تھا۔ جابر سے اس کی ملاقات اسی کام کے دوران ہوئی تھی جب وہ جابر کے ایک ہوٹل میں پینٹ کا کام کر رہا تھا۔ اس کی محنت اور جانفشانی سے خوش ہو کر جابر ہی نے ایک جگہ فون کر کے اس کے لئے معقول کام کا بندوبست کیا تھا۔

جابر حیران ہوا تھا کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود وہ رنگ کا کام کر رہا تھا پھر اس کی مجبوریاں جان کر اس نے کمال مہربانی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے اچھی جگہ سیٹ کروا دیا تھا اور آج وہی جابر...... بصیر کو پھر یاد آگیا تھا۔

بصیر کو لگ رہا تھا کہ اب اس کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔ پھر تقریباً آدھے گھنٹے بعد بصیر مرشد بازار میں خوشبویات کی اس بہت بڑی دکان کے سامنے کھڑا تھا جس کی عقبی سمت جابر کا دفتر تھا۔ جابر کے دفتر میں داخل ہونے سے پہلے اس کی تلاشی لی گئی جس پر اس نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

طویل الجثہ جابر ایک بہت بڑی ٹیبل کے عقب میں ریوالونگ چیئر پر براجمان تھا اور کسی گینڈے سے مشابہ نظر آتا تھا۔ بصیر نے سلام کیا۔ اس نے سر کے اشارے سے جواب دیتے ہوئے اسے بیٹھنے کو کہا۔

''بولو......؟ کیا کام ہے......؟'' بصیر ابھی پوری طرح بیٹھ بھی نہیں پایا تھا کہ جابر کی مخصوص غراہٹ آمیز آواز بلند ہوئی۔

''وہ جابر بھائی......! مجھے فوراً پاسپورٹ بنوانا ہے کچھ مسئلہ ایسا ہو گیا ہے کہ فوری طور پر پاکستان......''

''تین دن سے پہلے نہیں مل سکتا۔'' بصیر کی بات درمیان ہی سے کاٹتے ہوئے جابر کی غراہٹ آمیز آواز بلند ہوئی۔

''تین ہزار درہم خرچ ہوں گے، پہلے کاؤنٹر پر جمع کروا دو، تین دن بعد وہیں سے پاسپورٹ وصول کر لینا۔ اب جاؤ......!'' اور بصیر تھوک نگلتے ہوئے اٹھ کر دفتر سے باہر نکل آیا۔

جابر کا رویہ اس کا بات کرنے کا انداز عجیب وغریب تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ ایسا ہی ہے اور پھر وہ رقم ادا کرنے کے بعد واپس اپنے اپارٹمنٹ آ گیا۔

یہ تین دن اس نے کس طرح گزارے تھے وہی جانتا تھا۔ ٹھیک تین دن بعد وہ نا صرف پاسپورٹ وصول کر چکا تھا بلکہ اسی رات کی فلائٹ سے واپس پاکستان جانے کی تیاری بھی کر چکا تھا۔

علیزہ کے لئے، نیناں کے لئے اس نے خوب شاپنگ کی۔ علیزہ کے لئے کھلونے، چاکلیٹ اور نیناں کے لئے بھی بہت ساری چیزیں شامل تھیں۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ نیناں کے نین کہیں اور لڑ چکے ہیں، وہ یہ سب کرنے پر مجبور تھا اس کا دل ننیاں کو بے وفا تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ ضرور کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہوگئی تھی نیناں کو۔ وہ روٹھ گئی تھی اس سے۔

''میں منا لوں گا اس کو...... اس دوری پر معافی مانگ لوں گا اس سے...... محنت ہی کرنی ہے نا......؟ وہیں پاکستان میں کرلوں گا۔'' اس نے سوچا۔

وہ ائیرپورٹ کے لاؤنج میں بیٹھا ان ہی سوچوں میں غلطاں تھا جب ایک آواز پر اسے بے اختیار چونکنا پڑا۔

''مسٹر بصیر چوہان......؟'' ائیرپورٹ سیکورٹی کے دو اہلکار اس کے قریب موجود تھے۔ جن کی سوالیہ نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔

''کہئے......! کیا بات ہے......؟''

اس نے حیرت زدہ انداز میں سوال کیا تو سیکورٹی اہلکار کا ہاتھ مضبوطی سے

اس کے کندھے پر آ جما۔

''یو آر انڈر اریسٹ......! جعلی پاسپورٹ استعمال کرنے کے جرم میں آپ کو گرفتار کیا جاتا ہے۔''

☆☆☆

''تڑاخ......!'' تھپڑ اتنا ہی زور دار تھا کہ نیناں الٹ کر نیچے جا گری۔ وہ تو فرش پر بچھے دبیز قالین کی مہربانی تھی کہ نیناں کو مزید کوئی چوٹ نہیں آئی ورنہ جس انداز میں وہ اچھل کر نیچے گری تھی، اگر صرف فرش ہوتا تو نیناں کے جسم کی کوئی نہ کوئی ہڈی یقیناً اپنی جگہ تبدیل کر چکی ہوتی۔ لیکن یہ تھپڑ بھی خوب صورت دھان پان سی نیناں کے لئے کچھ کم نہیں تھا۔ اس کے سرخ و سپید گال پر انگلیوں کے واضح نشان ثبت ہو گئے تھے اور ان میں سے خون جھلک رہا تھا۔

وہ جہاں گری تھی وہیں کے وہیں ساکت پڑی رہ گئی۔ اس تھپڑ کی گونج نے اس کی روح تک کو زخما دیا تھا۔ وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ مردانہ وجاہت کا وہ شاہکار جسے اس نے اپنی محبت کی عبادت گاہ میں دیوتا کے رتبے پر فائز کیا تھا، اس کے ساتھ یہ سلوک بھی کر سکتا ہے؟ وہ جس کے لئے اس نے اپنا بسا بسایا گھر اجاڑ ڈالا تھا، وہ جس کے لئے اس نے اپنی گرہستی کو آگ لگا دی تھی، وہ جس کے لئے اس نے اپنی دنیا اور اپنی عاقبت دونوں خراب کر لی تھیں، اس کا یہ روپ بھی ہو سکتا ہے......؟

''نہیں نہیں......! ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے وہم ہوا ہے۔ میں کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔'' اس نے حیرت اور بے یقینی کے عالم میں سوچا لیکن حلق میں کھلتی ہوئی کڑواہٹ، آنکھوں سے بہنے والا نمکین پانی اور رخسار سے اٹھی ہوئی ٹیسیں اس کا مذاق اڑا رہی تھیں۔ اس پر دل کھول کر ہنس رہی تھیں۔ قہقہے لگا رہی تھیں اور یہ سب کچھ حقیقت کا احساس دلانے کے لئے ناکافی نہیں تھا۔

''حد ہوتی ہے...... برداشت کی بھی...... ایک حد ہوتی ہے...... اس گھر میں

یا تو میں رہوں گا یا پھر...... یا پھر یہ بچی...... ! سمجھیں تم......!'' شاہان دھاڑ رہا تھا پھر وہ پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور کچھ ہی دیر کے بعد زوردار آواز کے ساتھ دھڑ سے بیرونی دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈیوٹی پر جا چکا تھا اور نیناں...... وہ ساکت و جامد وہیں پڑی تھی۔

''کیا ہے یہ سب......؟ کیوں ہے......؟ یہ سب تو ٹھیک نہیں ہے...... کیا اسی لئے اس نے یہ قدم اٹھایا تھا......؟ کیا اس کا یہ فیصلہ غلط تھا......؟ کیا اسے واپس چلے جانا چاہئے......؟ لیکن نہیں......! واپس کہاں......؟ وہ تو ساری کشتیاں جلا کر آئی ہے۔'' نیناں سوچ رہی تھی۔ ایک لاوا تھا جو پک رہا تھا۔ اندر ہی اندر اسے جھلسائے دے رہا تھا۔

پھر اس کے اندر نفرت کی ایک لہر انگڑائی لے کر بے دار ہوئی اور اس کا پورا وجود جیسے زہر میں ڈوب گیا۔ اس کی مٹھیاں آہستہ آہستہ بھنچنے لگیں اور تنفس کی رفتار تیز ہوگئی۔ اس کے نتھنے تیزی سے پھول اور پچک رہے تھے اور سانسوں کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی ناگن پھنکار رہی ہو۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر کھڑی ہوگئی تھی اور اب اس کا رخ صحن کی طرف تھا۔

بہت مشکلوں سے اس نے شاہان کا موڈ درست کیا تھا لیکن بمشکل دو دن گزرے تھے اور آج...... آج پھر وہی ہوا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق ناشتہ تیار کیا تھا۔ شاہان کے کپڑے پریس کئے تھے اور اب شاہان کے ساتھ بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی کہ اچانک صحن میں کھیلتی علیزہ کے رونے کی آواز سن کر وہ بے اختیار صحن کی طرف لپکی تھی، جب شاہان نے مضبوطی سے اس کی کلائی تھام کر اسے واپس بٹھا دیا تھا۔

''نہیں......! رونے دو اسے...... ناشتہ کئے بغیر نہیں اٹھو گی تم......!''

''کیسی باتیں کرتے ہو شاہان......! بچی ہے وہ میری...... میرے وجود کا حصہ ہے وہ۔''

''غلاظت ہے وہ...... گندگی ہے تمہارے شوہر کی...... اس کے وجود کا حصہ ہے وہ...... تمہارے وجود کا نہیں۔''

وہ دھاڑتے ہوئے بولا اور سخت طیش میں آگیا تھا۔

''غلط بات نہیں کرو شاہان......! وہ صرف میرے شوہر کی بیٹی نہیں...... میری بھی بیٹی......''

''تڑاخ......!'' نیناں کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی شاہان کا ہاتھ گھوما تھا اور وہ اچھل کر فرش پر جا گری تھی۔

اور اب...... اب وہ صحن کی طرف جا رہی تھی۔ شاہان ڈیوٹی پر جا چکا تھا اور اس کا رخ صحن کے درمیان زمین پر لیٹی ننھی علیزہ کی جانب تھا جو اب بھی رو رہی تھی۔ نیناں کے دھیرے دھیرے اٹھتے ہوئے ہاتھ علیزہ کے پاس جا رکے اور پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھتی چلی گئی۔ چند لمحے خاموشی سے علیزہ کی شکل دیکھتی رہی پھر بولی۔

''میری بیٹی نہیں ہو تم......! غلاظت ہو تم......! گندگی ہو تم اپنے باپ کی...... اور تمہارا باپ...... تمہارا باپ انسان نہیں ہے...... شیش ناگ ہے وہ...... جس نے میری زندگی میں زہر گھول دیا ہے۔ جب سے میں نے اس سے شادی کی ہے میں یہ زہر پی رہی ہوں...... قطرہ قطرہ زہر دیا ہے اس نے مجھے...... سمجھیں تم......؟'' وہ چیخی۔

لیکن اس بے چاری کو اتنی عقل ہی کہاں تھی......؟ وہ تو اپنی معصوم معصوم آنکھوں سے اپنی ماں کو تکتے ہوئے روئے جا رہی تھی۔

ماں...... جس کے قدموں تلے جنت ہے، جس کی محبت کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ وہ ہمک ہمک کر رو رہی تھی۔ بازو لہرا رہی تھی کہ اس کی ماں اسے اٹھا کر سینے سے لگا لے لیکن اس کی ماں...... وہ اپنے حواسوں میں ہی کب تھی......؟ وہ نہ جنونی انداز میں اپنی ہی کہے جا رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ ساتھ والی چھت

پر موجود خاتون پروفیسر ازکی نا صرف اس سارے ڈرامے کو بغور دیکھ رہی ہیں بلکہ حرف بہ حرف اس کی گفتگو بھی سن رہی ہیں جبکہ نیناں کہہ رہی تھی۔

''لیکن اب...... اب میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔ یہ زندگی میری اپنی ہے۔ یہ فیصلہ بھی میرا اپنا ہے۔ میں کسی کو اس میں زہر نہیں گھولنے دوں گی۔ نہ تمہارے باپ کو...... اور نہ تمہیں...... تمہارا باپ ایک شیش ناگ ہے اور تم...... تم اس کی سنپولی ہو...... غلاظت ہو تم...... گندگی ہو تم اس کی...... تمہارے اندر اس کا زہر بھرا ہوا ہے اور آج میں یہ زہر نچوڑ دوں گی۔

میری بیٹی نہیں ہو تم...... سمجھیں...... میری بیٹی نہیں ہو تم......!'' وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی اور پھر اس کے دونوں ہاتھ روتی بلکتی ننھی علیزہ کے گلے پر جم گئے۔

ایک منٹ...... دو منٹ...... تین منٹ...... بچی نے ہاتھ پاؤں مارے...... تڑپی...... حلق سے چند گھٹی گھٹی خرخراہٹیں بلند کیں اور پھر ساکت ہو گئی...... بچی مر چکی تھی...... لیکن نیناں ابھی تک اس کا گلا دبوچے چیخ رہی تھی۔

''میری بیٹی نہیں ہو تم...... میری بیٹی نہیں ہو تم......!''

پروفیسر ازکی کی آنکھیں حیرت کی شدت سے پھٹ کر کانوں تک آ پہنچی تھیں اور وہ حیرت و خوف کے عالم میں منہ پر ہاتھ رکھے کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ پھر وہ ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گئیں۔

کافی دیر کے بعد ان کے حواس کچھ درست ہوئے تو وہ تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے آ پہنچیں اور پھر اگلے ہی لمحے وہ ریسیور کانوں سے لگائے بول رہی تھیں۔

''ہیلو......! پولیس اسٹیشن......؟''

☆☆☆

اُدھورے خواب

جیسے ہی فضا میں اللہ اکبر کی گونج سنائی دی، راجو نے ماہین کی پیشانی پر حسب معمول الوداعی بوسہ دیا اور ماہین سے الگ ہوگیا۔ ماہین بھی جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی تو راجو نے زمین پر بچھا ہوا کپڑا اٹھا کر جھاڑا اور کندھے پر رکھ لیا۔

دونوں ایک بار پھر بچھڑنے کے لئے تیار ہو چکے تھے۔ اگلی رات کو پھر سے ملنے کے لئے۔

حالانکہ دونوں جانتے تھے کہ وہ دونوں مل کر بھی نہیں مل سکتے، کبھی بھی نہیں۔ بھلا کبھی چاند اور زمین کا ملاپ بھی ہوا ہے......؟ دونوں دریا کے دو الگ الگ کنارے تھے جو ایک ساتھ بہہ تو سکتے ہیں لیکن کبھی مل نہیں سکتے۔

بقول شاعر ؎

اس لئے اپنا ملن ہو بھی نہیں سکتا تھا
ایک دریا کے کبھی دونوں کنارے نہ ہوئے

لیکن وہ دونوں شاید اس بات سے متفق نہیں تھے، کیونکہ دونوں نے ہی علم بغاوت بلند کر دیا تھا اور معاشرے کے اس قانون کے خلاف عمل پیرا ہوگئے تھے جسے دنیا امیری اور غریبی کے نام سے جانتی ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔ دونوں کے دلوں میں محبت کی مخملیں ریشمی کونپلیں پھوٹ

چکی تھیں جو رفتہ رفتہ قد آور درخت بنتی جا رہی تھیں۔ اس امر سے بے نیاز کہ اس کا انجام کیا ہوگا......؟

شاید اسی لئے کہا جاتا ہے کہ محبت اندھی ہوتی ہے اور محبت کرنے والے انجام کی پرواہ کرتے ہی کب ہیں......؟ اگر انجام کی پرواہ ہوتی تو لیلی مجنوں، سوہنی مہینوال، ہیر رانجھا اور انارکلی جیسی داستانیں کیسے جنم لیتیں......؟ سو یہ داستان بھی اپنے انجام کی طرف رواں دواں تھی اور راجو اپنے گھر کی طرف۔

گندم کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک پتلی پگ ڈنڈی راجو کو گاؤں سے لمحہ بہ لمحہ قریب لئے جا رہی تھی۔

"اشھد ان لا الہ الا اللہ......!" مولوی محمد شفیع کی پر اثر آواز فضا پر سحر طاری کر رہی تھی۔

ٹھیک اسی وقت قریبی درختوں کے جھنڈ سے چہچہاتی ہوئی چڑیوں کا ایک غول فضا میں بلند ہوا۔ شاید وہ بھی اپنے مالک کی حمد و ثنا کرتے ہوئے تلاش رزق کے لئے عازمِ سفر ہو رہی تھیں۔

کھیتوں کا طویل سلسلہ ختم ہوا تو سامنے ہی ایک نہر نظر آنے لگی جس کے دونوں اطراف میں اونچے اور گھنے درختوں کی لمبی قطاریں نظر آ رہی تھیں جن پر موجود مختلف قسم کے پرندوں کی رنگ برنگی آوازیں ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہی تھیں۔

لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے راجو نے پل کو کراس کیا تو قریب ہی موجود کسی کتے نے بھونک کر اپنی بے داری اور فرض شناسی کا احساس دلایا لیکن راجو پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بدستور چلتے ہوئے اب ایک گلی میں داخل ہو چکا تھا۔ اور پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ ننگی اینٹوں سے بنے ہوئے ایک مکان کے دروازے پر کھڑا تھا۔ دروازہ لکڑی کا بنا ہوا تھا اور خستہ ہونے کے باوجود راجو کا راستہ روکے کھڑا تھا۔ اس نے ہاتھ سے دروازے پر ہلکا سا دباؤ ڈالا لیکن بے

سود...... دروازہ اندر سے بند تھا۔

راجو نے سر کو کھجاتے ہوئے چند لمحوں کے لئے کچھ سوچا اور پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے کندھے اچکائے اور دروازے کی لٹکتی ہوئی زنجیر کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر دونوں پاؤں دروازے کے دونوں پٹوں کے درمیان لگے ہوئے لکڑی کے ڈنڈوں پر جما دیئے اور پھر اچھل کر دروازے کے اوپر سے ہوتے ہوئے دیوار پر پہنچ گیا۔

ایک لحظہ توقف کرنے کے بعد اس نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے وہ اندر کود چکا تھا۔ دھم کی آواز بلند ہوئی اور وہ دونوں پیروں کے بل زمین پر آ رہا۔

پاؤں زمین سے لگتے ہی وہ بے ساختہ دو چار قدم آگے کی طرف گیا اور پھر دونوں گھٹنوں کے بل تیزی سے بیٹھتا چلا گیا۔

زہرہ کی آنکھ حسب معمول مولوی محمد شفیع کی تاثر انگیز آواز ہی سے کھلی تھی۔ اس نے چارپائی سے اٹھ کر ایک انگڑائی لی اور پھر دوسری چارپائی پر موجود کھیس میں لپٹے ہوئے وجود کا کندھا پکڑ کر آہستہ سے ہلایا۔

''امی جان......! امی جان......! اٹھئے...... نماز پڑھ لیجئے۔'' امی جان نے چہرے سے کھیس ہٹایا تو زہرہ ان کی طرف سے مطمئن ہوگئی۔ پھر اس نے وضو کیا اور جائے نماز بچھا کر اپنے معبود کے حضور سجدہ ریز ہوگئی۔

جب نماز پڑھ کر اس نے سلام پھیرا تو دوسرے جائے نماز پر امی جان موجود تھیں۔ اس نے جائے نماز اٹھا کر رکھی اور حسب معمول جھاڑو اٹھا کر گھر کی صفائی میں جت گئی۔ دونوں کمروں کے بعد صحن کی صفائی مکمل کی اور پھر باورچی خانے میں داخل ہوگئی جہاں امی جان لکڑیاں جلانے کے بعد چولہے پر توا رکھے روٹی بنانے میں مصروف تھیں۔

صبح کے ملگجے اندھیرے میں جلتی ہوئی آگ کی سرخ سرخ روشنی امی جان کے چہرے سے منعکس ہو رہی تھی اور ان کے بالوں میں کثرت سے موجود چاندی

جیسے بال بھی چمکتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ زہرہ اس منظر کو دیکھ کر کچھ اداس ہوگئی۔ کچھ ہی عرصہ تو گزرا تھا جب امی جان، ابو اور بھائی سب ایک ساتھ بیٹھ کر ناشتہ کر رہے ہوتے تھے۔ لیکن اب...... اب ابو موجود نہیں تھے، وہ ہمیشہ کے لئے جا چکے تھے۔ ایک ایسے سفر پر، ایک ایسی منزل کی جانب جہاں جانے والے کبھی لوٹ کر واپس نہیں آتے تھے۔

زہرہ کی آنکھیں بھر آئیں اور حلق میں جیسے گولہ سا اٹک گیا۔ امی جان نے روٹی بیلتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو زہرہ کو یوں خاموش گم سم کھڑا پایا۔ وہ اس کے احساسات پڑھ چکی تھیں۔ انہوں نے روٹی توے پر چھوڑی اور اٹھ کر بے اختیار زہرہ کو سینے سے لگا لیا۔

''زہرہ......! میری جان......! بیٹا......! دیکھو...... صبر سے کام لو...... ایسا نہیں کرتے۔ تم تو سمجھدار ہو نا......؟'' اس دلاسے پر تو زہرہ کی آنکھوں سے جیسے ساون کی جھڑی لگ گئی۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی اور امی جان اپنے آٹے سے لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے مسلسل اس کے آنسو صاف کر رہی تھیں مگر وہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی اور پھر وہ توے سے اٹھنے والا دھواں ہی تھا جس نے یہ سلسلہ ختم کروایا۔ امی جان جلدی سے چولہے کی طرف بڑھیں۔

''دیکھو...... روٹی جل گئی پگلی......! جا...... جا کر آنکھوں میں پانی کے چھینٹے مار......تو تو میری بہت بہادر بیٹی ہے۔''

امی جان ٹوٹی ہوئی آواز میں اپنے لہجے میں در آنے والے بے اختیار کرب کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے روٹی کی طرف متوجہ ہوگئیں۔ اور زہرہ باورچی خانے سے باہر نکل کر ایک مرتبہ پھر غسل خانے کی طرف چل دی۔ منہ ہاتھ دھو کر اندر کمرے میں داخل ہوگئی۔ اتنی سی دیر میں ہی اس کی خوب صورت موٹی موٹی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں۔

شاید قدرت نے اس کو رونے کے لئے پیدا نہیں کیا تھا۔ حسن کی جس

دولت سے اسے سرفراز فرمایا گیا تھا، اسے تو راج کرنا چاہئے تھا۔ اگر اس کے ماں باپ نے اس کا نام زہرہ رکھا تھا تو کیا غلط تھا......؟ وہ تھی بھی تو زہرہ جمال و زہرہ جبیں...... لمبے گھنے سیاہ بال، سرخ و سپید رنگت، لمبی صراحی دار گردن، متناسب وجود، سرو قد، کیا نہیں تھا اس کے پاس......؟ سب کچھ تو تھا۔

ہاں...... اگر نہیں تھا تو نصیب نہیں تھا۔ وہ محلوں کی رانی نہیں تھی۔ ایک غریب کی بیٹی تھی۔ غریب جس کا نصیب ہی غربت کی چکی میں پسنا ہوتا ہے۔ لیکن اب وہ غریب باپ بھی اس کے سر پر نہیں رہا تھا۔

بقول شاعر ؎

خود اپنے شور تنفس میں چونک اٹھتا ہے
جوان بیٹیوں کا باپ سو نہیں سکتا

لیکن یہ بھی قدرت کی ستم ظریفی ہی تھی کہ اس کا باپ سو چکا تھا اور وہ بھی ہمیشہ ہمیشہ کی نیند...... کبھی نہ بے دار ہونے کے لئے۔

☆☆☆

موٹر سائیکل لاک کرنے کے بعد وہ اندر داخل ہوا تو ڈسپنسری میں موجود اکلوتے کمپاؤنڈر نے اسے سلام کیا۔ وہ سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا اپنے کمرے میں داخل ہوا اور پھر اپنی کرسی پر براجمان ہوگیا۔

یہ ڈاکٹر عدیل احمد تھا۔ گاؤں کی اس ڈسپنسری کا اکلوتا ڈاکٹر......! معقول شکل وصورت کا مالک اور کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ بھرا بھرا سڈول اور توانا جسم، دراز قد، چوڑی پیشانی اور سیاہ چمکدار آنکھیں اسے ایک ذہین انسان ظاہر کرتی تھی۔ ایم بی بی ایس اس نے نوٹ چھاپنے یا کمانے کے لئے نہیں کیا تھا کیونکہ اللہ کا دیا سب کچھ تو تھا اس کے پاس۔

اس کے دل و دماغ میں تو بس ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی۔

”دکھی انسانیت کی خدمت......!“

اور اسی جذبے کے تحت وہ ڈاکٹر بنا تھا۔ اگر آج وہ پنجاب کے اس دور دراز دیہات میں اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔
دنیا کے اس عجائب خانے میں جہاں بھانت بھانت کے لوگ پائے جاتے ہیں، وہاں کبھی کبھار آپ کو ایسے عجوبہ اشخاص بھی مل ہی جاتے ہیں جو تن، من، دھن سے صرف اور صرف حب الوطنی اور خدمت انسانی کے لئے اپنے آپ کو وقف کیے ہوئے ہوتے ہیں۔
موجودہ بے حس معاشرے اور نفسانفسی کے اس دور میں لوگوں کو یہ تصویر شاید عجیب لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خال خال ہی سہی لیکن ایسے لوگ اب بھی موجود ضرور ہیں اور شاید انہی لوگوں کی وجہ سے یہ دنیا قائم ہے۔
عدیل ابھی آکر بیٹھا ہی تھا کہ وہ گھبرائی ہوئی سی اندر داخل ہوئی۔
''ڈاکٹر صاحب...... جلدی میرے ساتھ چلیں...... وہ امی جان...... امی جان کی طبیعت خراب ہے...... بہت خراب...... ڈاکٹر صاحب جلدی کریں۔'' اور پھر اس نے پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔
عدیل ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا لیکن جو منظر اسے نظر آ رہا تھا اس نے اس کے دل و دماغ میں ہلچل مچا دی تھی۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی کہ کوئی بھی صاحب دل اسے دیکھے تو دل تھام کر رہ جائے۔ لیکن اس وقت وہ سہمی ہوئی معصوم ہرنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی جھیل سی گہری آنکھوں سے اشکوں کی برسات کا منظر بہت دلکش تھا مگر عدیل کے بے قابو ہوتے ہوئے دل کو یہ آنسو اچھے نہیں لگے۔ ان خوب صورت آنکھوں میں آنسو نہیں شرارت کی چمک ہونی چاہیے۔ اس نے سوچا، بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھ ڈالے ور اس سے کہے۔
''سنو...... کبھی رونا نہیں...... کبھی بھی نہیں...... تمہاری یہ خوب صورت آنکھیں قدرت نے رونے کے لئے نہیں بنائیں۔ ان میں تو خوشیوں کے دیپ

جگمگانے چاہئیں۔ سدا زندہ رہنے والے خوشیوں کے دیپ۔ ہمیشہ روشن رہنے والی خوشیوں کے دیپ۔ لیکن وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی جرأت نہ کر سکا۔

اس لڑکی کو وہ پہلی مرتبہ دیکھ رہا تھا۔ اسے افسوس تھا اس لڑکی کو پہلے کیوں نہیں دیکھا......؟ اور پھر اس نے بمشکل اپنے آپ کو اس بے خودی سے نکالا تو اسے احساس ہوا کہ وہ کسی مصیبت میں ہے۔ اس کی امی جان کی طبیعت خراب ہے۔ اس کا دل اس لڑکی کے لئے ہمدردی سے لبالب بھر گیا اور پھر احساس فرض شناسی بھی بے دار ہوگیا پھر جب وہ بولا تو اپنے آپ کو مکمل طور پر سنبھال چکا تھا۔

"دیکھو...... پریشان ہونے کی بالکل ضرورت نہیں ہے۔ اللہ نے چاہا تو تمہاری امی بالکل ٹھیک ہو جائیں گی۔ میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ......!" اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد میڈیکل باکس اٹھائے وہ اس پری وش کے ساتھ ڈسپنسری سے باہر نکل رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے گھٹنے سیدھے کئے اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا لیکن سامنے نظر پڑتے ہی وہ ساکت ہوگیا۔ دونوں کولہوں پر ہاتھ رکھے کھڑی ہوئی وہ اسے کڑی نظروں سے گھور رہی تھی۔ ایک لحظہ ٹھٹکنے کے بعد وہ اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔ دوسرے ہی لمحے اس کے ہونٹوں پر شہد آگیں مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔

لیکن اس کے رویے میں کوئی فرق نہیں آیا اور پھر اس کی غصیلی آواز بلند ہوئی۔

"بھائی......! تم باز نہیں آؤ گے اپنی حرکتوں سے......؟ کہاں تھے ساری رات......؟ کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو......؟ تمہیں میرا اور امی کا ذرا بھی خیال نہیں......؟"

اس کی غصیلی اور کاٹ دار آواز جملے کے اختتام تک آنسوؤں میں بھیگ چکی

تھی۔

''اوہو...... زہرہ......! اب رونا دھونا اسٹارٹ نہ کر دینا...... اچھا یہ بتاؤ...... امی جان تو نہیں اٹھیں نا ابھی......؟'' اس نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا۔

''اٹھ چکی ہیں اور نماز پڑھنے کے بعد اب ناشتہ بنا رہی ہیں۔''

''اوہو......! تو انہیں پتا چل گیا کہ میں گھر پر نہیں ہوں......؟'' اس نے گھبرا کر سوال کیا۔

''پتا نہیں......! میں انہیں اٹھا کر نماز پڑھنے چلی گئی تھی۔ نماز پڑھ کر آئی تو وہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ اس دوران میں صفائی کرنے لگی۔ صفائی سے فارغ ہوئی تو وہ ناشتہ بنا رہی تھیں۔ اگر پتا چل بھی گیا ہوگا تو بھی انہوں نے مجھ سے نہیں پوچھا۔'' زہرہ نے جواب دیا۔

''ارے...... باپ رے باپ......! اگر پتا چل گیا تو......؟'' راجو نے پریشانی سے کہا۔

''چل بھی گیا تو کیا ہوگا......؟ جل کڑھ کر چپ ہو جائیں گی۔ بھائی......! وہ ماں ہیں ماں...... دنیا کی سب سے عظیم ہستی...... سب سے عظیم رشتہ...... وہ ماں جس کے قدموں تلے جنت ہے...... ماں تو دنیا میں خدا روپ ہے...... وہ تمہیں کہیں گی بھی کیا......؟ وہ کسی شاعر نے کہا ہے نا کہ ؎

خالق کو اپنی خلق سے الفت تھی اس لئے
جنت اتار ڈالی ہے ماؤں کے روپ میں

شعر پڑھتے ہوئے اس کا لہجہ نرم ہوگیا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے والی زہرہ نہیں لگ رہی تھی۔

''لیکن بھائی......! تمہیں سدھر جانا چاہئے۔ میں جانتی ہوں کہ تم ماہین کے چکر میں پڑے ہوئے ہو لیکن بھائی......! چوہدری جہانگیر کوئی معمولی آدمی نہیں...... ایم این اے ہے ایم این اے...... تم نے دیکھا جب وہ باہر نکلتا ہے تو اس کے

آگے پیچھے کتنے بندوق بردار ہوتے ہیں......؟ اور پھر بھائی......! ماہین کے پانچ بھائی ہیں اور پانچوں کے پانچوں ایک سے بڑھ کر ایک لچے اور خطرناک...... تم کیوں اپنی جان کے دشمن ہو رہے ہو......؟ اپنے آپ کو اپنی حیثیت کو پہچانو......! تم ایک چوکیدار کے بیٹے ہو۔ ہمارا اور ان لوگوں کا کوئی جوڑ نہیں ہے۔ خدا کے لئے بھائی......! باز آجاؤ......! اپنی حرکتوں سے۔''

زہرہ نے روتے ہوئے جب اپنی بات ختم کی تو اس کے دونوں ہاتھ اپنے بھائی کے سامنے جڑے ہوئے تھے۔ راجو نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''رومت پگلی......! چوہدری جہانگیر ہوگا جو ہوگا لیکن میں نے محبت کی ہے...... کوئی جرم نہیں کیا اور پھر ماہین بھی تو مجھے چاہتی ہے۔'' راجو نے جیسے خود کو تسلی دی۔

''اچھا...... اس موضوع پر پھر بات ہوگی۔ ابھی چلو ناشتہ کر لو......!'' اس نے بھائی کی بھوک کے پیش نظر بات سمیٹی۔ وہ جانتی تھی کہ رات سے اس نے کچھ نہیں کھایا۔

☆☆☆

دبلی پتلی دھان پان سی یہ خوب صورت لڑکی جو اپنے آپ کو ایک سیاہ چادر میں چھپائے رات کی تاریکی میں حویلی کے پچھلے دروازے سے برآمد ہوئی تھی۔ ماہین کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی اس نے رک کر چاروں طرف نظر دوڑائی اور پھر آہستہ آہستہ دبے قدموں چوروں کی طرح ایک طرف روانہ ہوگئی۔

وہ بار بار کن انکھیوں سے اردگرد کا جائزہ بھی لیتی جا رہی تھی۔ لیکن اپنی تمام تر احتیاط کے باوجود وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایک ہیولہ مسلسل اس کے تعاقب میں تھا۔ جو اس عقبی دروازے سے باہر نکلا تھا جہاں سے چند لمحے قبل ماہین

نکلی تھی۔

ہیولہ بڑی ہوشیاری اور چابک دستی سے ماہین کا تعاقب کر رہا تھا جبکہ ماہین آگے ہی آگے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ اچانک ایک کھٹکے کی آواز سن کر ماہین ٹھٹک کر رک گئی اور پھر تیزی سے اس نے پیچھے پلٹ کر دیکھا لیکن ہیولہ بجلی کی سی تیزی سے بڑی مہارت کے ساتھ ایک درخت کے پیچھے غروب ہو چکا تھا۔ نتیجتاً ماہین کو اپنے عقب میں کچھ نظر نہ آ سکا۔

چند لمحے ہراساں نظروں سے ماحول کا جائزہ لینے کے بعد آخرکار ماہین ایک مرتبہ پھر چلنے لگی۔ ہیولہ ایک مرتبہ پھر اس کے تعاقب میں تھا لیکن اب وہ پہلے سے زیادہ محتاط تھا۔

نہر کا پل کراس کرنے کے بعد اب ماہین گندم کے کھیتوں کے درمیان ایک پتلی پگ ڈنڈی پر چل رہی تھی۔ ہر طرف گہرا سکوت اور سناٹا طاری تھا۔ البتہ کبھی کبھی گونج اٹھنے والی کسی نہ کسی جھینگر کی آواز رات کے اس سکوت کو مجروح کر دیتی تھی لیکن ماہین ان سب باتوں سے بے نیاز دل کے ہاتھوں مجبور اور محبت کے نشے میں ڈوبی چلی جا رہی تھی۔

بلاشبہ رات کی اس تاریکی اور سکوت کے عالم میں ایک تن تنہا لڑکی کا اکیلے اتنی دور تک کا سفر کرنا خاصا حیرت ناک تھا لیکن یہ پیار ایسی ہی حیرت ناک بیماری ہے جس کا مریض کسی خطرے کو خاطر میں نہیں لاتا۔ کچے گھڑے پر دریا پار کر جاتا ہے۔ دودھ کی نہریں بہا دیتا ہے۔ یہ روگ لادوا ہے اگر اس کی دوا کوئی ہے تو وہ ہے یار کا دیدار۔

بقول شاعر

تشخیص بجا ہے کہ مجھے عشق ہوا ہے
نسخے میں لکھو ان سے ملاقات زیادہ

اور بالآخر ماہین کو بھی یار کا دیدار ہوگیا۔ وہ ایک درخت کے نیچے کپڑا

بچھائے بیٹھا انتظار کی گھڑیاں شمار کر رہا تھا اور آخر کار اس کا انتظار بھی ختم ہو گیا تھا۔ اس نے جلدی سے کھڑے ہو کر اپنے دونوں بازو پھیلائے تو ماہین کٹی ہوئی پتنگ کی طرح اڑتی ہوئی اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار تک آ پہنچی۔

کتنی ہی دیر تک دونوں خاموش رہے لیکن وہ دونوں خاموش کب تھے......؟ ان کی تو دھڑکنیں ایک دوسرے سے مخاطب تھیں۔ جو ایک دوسرے کو اپنی محبت کا یقین دلا رہی تھیں۔ پھر راجو نے آہستگی کے ساتھ ماہین کو خود سے الگ کیا اور دونوں نیچے بیٹھ گئے۔ ایک امیر زادی ایک غریب کے ساتھ زمین پر بیٹھ کر بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔

"تمہیں عجیب نہیں لگتا اس طرح زمین پر بیٹھنا......؟" راجو نے سوال کیا۔

"یہ چاہت ہے، یہی تو محبت ہے جو اونچ نیچ، ذات پات، امیری غریبی کسی چیز کو نہیں مانتی۔ میرے دل میں بسنے والا جذبہ انمول ہے جو دوسرے کو ہمیشہ کے لئے خرید لیتا ہے۔" ماہین نے والہانہ انداز میں اسے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

لیکن پیار، محبت، خلوص، سندر جذبے ساری باتیں اپنی جگہ ایک اور چیز بھی تو ہوتی ہے نا...... جس کے آگے کسی کا بس نہیں چلتا۔ وہ ہے تقدیر۔ راجو اور ماہین دونوں آپس میں دنیا جہان کی باتیں کر رہے تھے۔ خوش ہو رہے تھے۔ لیکن تقدیر...... تقدیر ان پر ہنس رہی تھی۔ قہقہے لگا رہی تھی مگر راجو اور ماہین دونوں نے اس کی طرف سے اپنے کان بند کر رکھے تھے۔ وہ دونوں تو ایک دوسرے میں گم تھے۔ ہر چیز سے بے نیاز، انہیں ایک دوسرے کے علاوہ کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔

وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ باتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتی تھیں۔ لیکن وقت آخر ان کو کتنی مہلت دے سکتا تھا......؟

ملاقات کا وقت ختم ہوا......!" یہ اعلان فضا میں بلند ہونے والی مولوی محمد شفیع کی آواز نے کیا۔ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ راجو نے زمین پر بچھا اپنا کپڑا

اٹھا کر جھاڑا اور کندھے پر رکھ لیا۔ ماہین بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر دونوں ایک بار پھر ایک دوسرے میں سما گئے جیسے کہہ رہے ہوں۔

دلوں میں پھوٹتے جذبے
تناور ہو گئے اب تو
ہمارے واسطے
جاناں......!
انہی جذبوں کی
ہر چوٹی
کو سر کرنا
ضروری ہے
گلے ملنا
ضروری ہے......!

دونوں آہستگی سے الگ ہوئے اور پھر اپنے اپنے راستے پر ہو لیے۔ چند ہی لمحوں کے بعد ایک ہیولہ درخت کے پیچھے سے برآمد ہوا۔ جو ایک بار پھر ماہین کے تعاقب میں تھا۔

☆☆☆

زہرہ صحن میں تھی کہ ماں کے مسلسل کھانسنے کی آواز سن کر پریشان ہو گئی۔
زہرہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوئی، ٹھٹک گئی۔

''امی جان......! امی جان......!'' چلاتے ہوئے ماں کی جانب لپکی۔ وہ مسلسل کھانس رہی تھیں۔ ان کا ایک ہاتھ بری طرح اپنا سینہ مسل رہا تھا اور قریب خون ہی خون بکھرا ہوا تھا۔ شاید انہوں نے خون کی الٹی کی تھی۔

زہرہ نے جلدی سے سنبھالنے کی کوشش کی۔ ایک ہاتھ ان کے سر کے نیچے

وقار عظیم
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

رکھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ ان کا سینہ مسلنے لگی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے......؟

پھر وہ جلدی سے اٹھ کر باہر لپکی۔ کانپتے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا اور گھڑے میں سے پانی انڈیلنے لگی۔ کچھ پانی گلاس میں ایا۔ کچھ چھلک کر زمین پر آ رہا۔ وہ گلاس اٹھا کر الٹے پاؤں واپس بھاگی۔ ایک مرتبہ پھر اس کا ایک ہاتھ امی جان کے سر کے نیچے تھا اور دوسرے ہاتھ سے وہ گلاس امی جان کے منہ سے لگا کر انہیں پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی۔ اور اپنی اس کوشش میں وہ کسی حد تک کامیاب بھی رہی۔

لیکن امی جان کو کچھ افاقہ نہ ہوا تو وہ گھبرا کر پھر اٹھ کر بھاگی۔

''راجو بھائی......! راجو بھائی......!'' کہتی ہوئی وہ دوسرے کمرے کی طرف بھاگی لیکن راجو کمرے میں ہوتا تو ملتا......؟ وہ گھبرا کر واپس کمرے کی طرف بھاگی لیکن امی جان کو دیکھ دیکھ کر اس کا دل ہول رہا تھا۔ پھر وہ واپس صحن کی طرف آئی اور دروازہ کھول کر باہر گلی میں آ گئی۔

اب وہ گاؤں کی اکلوتی ڈسپنسری کی طرف سرپٹ بھاگی جا رہی تھی۔ اس بات سے بے نیاز کہ اس کا حلیہ کیا ہے......؟ سر پر دوپٹہ ہے یا نہیں......؟ پاؤں میں جوتی ہے یا نہیں......؟ گلی میں آتے جاتے لوگ اسے کن نظروں سے دیکھ رہے ہیں......؟ اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد وہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر واپس اپنے گھر میں داخل ہوئی تھی۔

جب وہ کمرے میں پہنچی تو امی جان بے حس و حرکت تھیں۔ شاید اب وہ کچھ سکون میں تھیں لیکن وہ ابھی بھی زمین ہی پر پڑی تھیں۔

ڈاکٹر عدیل نے تیزی سے آگے بڑھ کر امی جان کی نبض چیک کی اور پھر میڈیکل باکس کھول کر انجکشن تیار کرنے لگا۔ اور پھر دوسرا انجکشن لگانے کے بعد وہ دوبارہ اپنے میڈیکل باکس پر جھک گیا۔

چند ٹیبلٹس اور کچھ کیپسول نکال کر اس نے انہیں الگ الگ کیا اور پھر زہرہ کو سمجھانے لگا کہ یہ اس نے کس طرح انہیں استعمال کروانے ہیں۔ ٹھیک اسی لمحے امی جان کی آواز بلند ہوئی۔

''زہرہ......! تھوڑا پانی دو مجھے......!'' اور زہرہ ''جی امی'' کہہ کر باہر کی طرف لپکی جبکہ عدیل اس خوب صورت نام کو من ہی من میں دہرانے لگا۔

پتا نہیں کیوں جب سے اس نے زہرہ کو دیکھا تھا، اسے اپنی دھڑکنوں پر اختیار نہیں رہا تھا۔ وہ جتنا انہیں سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا، دھڑکنیں اتنی ہی بے قابو ہو رہی تھیں اور دل تھا کہ اتھل پتھل ہوا جا رہا تھا۔

ایک عجیب سی مقناطیسی کشش تھی زہرہ میں جو اسے اپنی طرف کھینچتی تھی اور وہ ڈاکٹر ہوتے ہوئے بھی اپنی اس کیفیت کو کوئی نام دینے سے قاصر تھا۔ اس بیماری کی تشخیص اس کے لئے مشکل ہوگئی تھی یا شاید جان بوجھ کر وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکاری تھا۔

بہرحال جو کچھ بھی تھا یہ بات سچ تھی کہ کچھ نہ کچھ ہوا ضرور تھا۔ جو عدیل کی اب تک کی زندگی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ کچھ انوکھا، کچھ مختلف...... یہ بے خودی کی حالت اس کے لئے عجیب ضرور تھی لیکن ناگوار بہرحال نہیں تھی۔ یہ تو ایک اچھوتا احساس تھا جس سے اسے آج آشنائی ہوئی تھی۔

وہ اپنے ہی خیالات میں محو تھا کہ زہرہ کی آمد نے یہ تسلسل توڑ دیا۔ وہ اپنی ماں کو سہارا دیئے انہیں پانی پلا رہی تھی اور عدیل ایک ٹک اسے دیکھے جا رہا تھا کہ اچانک زہرہ نے اس کی طرف دیکھا۔

شاید اس کی کسی مخصوص حس نے عدیل کی نگاہوں کا احساس دلایا تھا۔ نظروں سے نظریں ٹکرائیں اور زہرہ کے چہرے پر سرخی سی چھا گئی۔ اس نے گھبرا کر نظریں چرائیں اور عدیل کو اس کے چہرے پر بکھرتا ہوا یہ رنگ بہت بھلا لگا۔

☆☆☆

چٹاخ کی تیز آواز کے ساتھ پورا کمرہ گونج اٹھا۔

''مم...... مم...... میں سچ کہہ رہا ہوں مائی باپ......!'' ایک منمناتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔ یہ رحیم دادا تھا جس کے منہ پر چوہدری جہانگیر کا زوردار تھپڑ پڑا تھا۔

رحیم دادا کا پورے گاؤں اور ساتھ ساتھ آس پاس کے کئی دیہاتوں میں بڑا رعب تھا۔ ہٹا کٹا جوان، چہرے پر کئی زخموں کے نشان، بڑی بڑی مونچھوں سے ڈھکے ہوئے سفاک ہونٹ، اس کی اصلیت کو ظاہر کرنے کے لئے کافی تھے۔

وہ خطرناک اشتہاری تھا جس کے کھاتے میں پولیس نے کم از کم سات قتل ڈالے ہوئے تھے لیکن وہ چوہدری جہانگیر کی سرپرستی میں کھلے عام دندناتا پھر رہا تھا۔ چوہدری جہانگیر کے کسی بھی معاملے میں اس کے ہلکے سے اشارے پر مار دھاڑ کرنا اس کا فرض اولین تھا۔

پولیس کی مجال ہی کیا تھی کہ اسے ہاتھ تک لگاتی۔ لیکن وہی رحیم دادا اس وقت بھیگی بلی بنا ہوا ہاتھ باندھے چوہدری جہانگیر کے سامنے کھڑا تھا۔ اور چوہدری جہانگیر کا چہرہ لال بھبھوکا ہو رہا تھا۔ وہ کسی بھوکے شیر کی طرح کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

خوب صورت قالین، جہازی سائز کا بیڈ، کھڑکیوں اور دروازوں پر مخملیں پردے، دیوار پر ٹنگی ہوئی تلواروں کا سیٹ ظاہر کر رہا تھا کہ یہ چوہدری جہانگیر کا بیڈ روم تھا۔ چکر کاٹتے کاٹتے چوہدری جانگیر عین رحیم دادا کے سامنے آن رکا اور اپنی سرخ انگارہ آنکھیں رحیم دادا کے چہرے پر گاڑھ دیں اور پھر اس کی مٹھیاں بھنچتی چلی گئیں۔ پھر جب وہ بولا تو اس کی آواز کسی بھیڑیے کی غراہٹ سے مشابہہ تھی۔

''رحیم دادا......! تم نے اسے زندہ چھوڑ دیا......؟''

''آپ کا حکم چاہئے مائی باپ......! آپ کی اجازت کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی سانسوں کی ڈور کسی وقت بھی توڑی جا سکتی ہے۔ آپ حکم تو

کریں......!''

''ہوں......!'' وہ غرایا اور پھر اس کے قدموں نے ایک مرتبہ پھر نرم و ملائم قالین کو روندنا شروع کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح ٹہلتا رہا اور پھر شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کے کھنچاؤ میں بھی کمی آ گئی تھی اور شاید اعصاب بھی پرسکون ہو گئے تھے۔ اب وہ اپنے بیڈ پر بیٹھا لمبی لمبی سانسیں لے رہا تھا۔ پھر جب اس کی آواز بلند ہوئی تھی تو اس کا لہجہ برف کی طرح سرد تھا۔

''رحیم دادا......! اس کتے کے پلے کو آسان موت نہیں دینی۔ سوچنا پڑے گا۔ دیکھنا پڑے گا کہ کیا کیا جا سکتا ہے......؟ تم جاؤ......! اور دلاور کو میرے کمرے میں بھیج دو......!''

''جو حکم مائی باپ......!'' رحیم دادا نے جواب دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

یہ ایک بہت بڑا ہال کمرہ تھا اور اس وقت اس میں پورے گاؤں کے معتبر بڑے بوڑھے لوگ جمع تھے۔ عبدالرشید آرائیں، سرور جٹ، اصغر مشین والا، مجاہد قادری، مولوی محمد شفیع اور یہی نہیں...... آس پاس کے دیہاتوں کے چند بڑے زمیندار بھی جمع تھے۔

اور یہ سب لوگ مل کر ایک پنچائت کی شکل اختیار کیے ہوئے تھے اور گاؤں میں تب تب ایسی پنچائتیں ضرور ہوا کرتی تھیں جب جب کوئی مشکل فیصلہ کیا جانا ہوتا تھا۔ مشکل کیا تھی اور کس کی تھی یہ ہال میں موجود لوگوں میں سے ابھی تک کسی کو معلوم نہیں تھا۔ لیکن یہ سبھی جانتے تھے کہ آج کی یہ پنچائت چوہدری جہانگیر نے بلوائی تھی۔

اس وقت گاؤں والوں اور زمینداروں کے علاوہ چوہدری جہانگیر کے پانچوں بیٹے بھی ہال میں موجود تھے۔ البتہ چوہدری جہانگیر ابھی تک یہاں نہیں آیا

پاکستان ڈائجسٹ وقار عظیم

تھا اور اس کی اونچی اور سب سے نمایاں نشست ابھی تک خالی پڑی تھی اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد چوہدری جہانگیر ہال کمرے میں داخل ہوا۔ بالکل کسی مغل بادشاہ کی طرح اکڑا ہوا۔ وہ سیدھا اپنی نشست کی طرف بڑھا تو ''سلام چوہدری صاحب'' کی آوازوں سے کمرہ گونج اٹھا۔

چوہدری جہانگیر سر کے اشارے سے جواب دیتا ہوا سیدھا جا کر اپنی نشست پر براجمان ہوگیا۔ اس طرح کہ اس کی کرسی کی دائیں جانب رحیم دادا ٹرپل ٹو اٹھائے مستعد کھڑا تھا اور بائیں جانب ریپیٹر اٹھائے دلاور کھڑا تھا۔ چند لمحوں تک ڈرامائی سکوت طاری ہوا۔ پھر چوہدری جہانگیر کی آواز نے اس مہر سکوت کو توڑا اور اس کی ٹھہری ٹھہری پرسکون مگر بھاری اور بارعب آواز کمرے میں گونجی۔

''آپ سب لوگ یہاں آئے، اس کے لئے شکریہ......! بات دراصل یہ ہے کہ میں کوئی ایسا فیصلہ ہرگز نہیں کرنا چاہتا جس سے کوئی یہ سمجھے کہ میں نے کسی کے ساتھ کوئی ظلم یا زیادتی کی ہے۔ کرنے کو میں سب کچھ بنا کسی کو کچھ بتائے خود بھی کرسکتا تھا۔ لیکن چوہدری جہانگیر کمزور نہیں ہے۔ میری رگوں میں دوڑنے والا خون آج بھی لاوے کی طرح ابلتا ہوا ہے۔ وہ خون سرد نہیں ہوا ہے۔ اور کوئی ہماری غیرت کو للکارے تو یہ بات میں برداشت نہیں کرسکتا۔ ایک گھٹیا، غلیظ اور نیچ انسان نے یہ جرأت کی ہے۔''

''بابا جانی......! یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں......؟ کس میں اتنی ہمت ہے کہ ہمارے باپ کی غیرت کو للکارے......؟ آپ نام بتائیں......! ہم اس کا سر کاٹ دیں گے۔'' چوہدری یاسر نے کھڑے ہو کر کہا جو چوہدری جہانگیر کا چھوٹا بیٹا تھا۔

''اوئے......تم چپ کرو......! یہ سب کچھ میں خود بھی کرسکتا تھا لیکن یہ میرا مقصد نہیں...... میں ساری بات سارے گاؤں والوں کے علم میں لانا چاہتا ہوں

تا کہ یہ لوگ مجھے ظالم بھی نہیں کہیں اور آئندہ کسی کی ایسی جرأت بھی نہ ہو...... سمجھا......؟ بیٹھ جا نیچے......!'' اور چوہدری یاسر بادل ناخواستہ نیچے بیٹھ گیا۔

''چوہدری صاحب......! آخر ہوا کیا ہے......؟ اور کس نے ایسی جرأت کر لی جس کے نتیجے میں آپ کو پنچائت بلانی پڑی......؟'' چوہدری نظام جو قریبی گاؤں کا زمیندار تھا، چوہدری جہانگیر سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا تو چوہدری جہانگیر نے دلاور کی طرف دیکھا۔

دلاور نے اپنا کان چوہدری جہانگیر کے چہرے کے قریب کیا۔ چوہدری جہانگیر نے اس کے کان میں دھیرے سے کچھ کہا۔ دلوار نے سر ہلایا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہال کمرے سے باہر نکل گیا۔ چوہدری جہانگیر نے سب لوگوں پر ایک طائرانہ نظر دوڑائی اور سلسلہ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے بولا۔

''میں نے مجرم کو بھی بلوا لیا ہے تاکہ فیصلہ بھی ساتھ کے ساتھ ہی ہو جائے۔''

''مجرم آخر ہے کون چوہدری صاحب......! کچھ پتا تو چلے......؟'' سرور جٹ نے سوال کیا جو گاؤں کا ایک زمیندار لیکن نسبتاً چھوٹا زمیندار تھا۔

''اسماعیل چوکیدار کو تو سب جانتے ہیں نا......؟'' چوہدری جہانگیر نے استفہامیہ نظروں سے مجمع کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں......! لیکن چوہدری صاحب......! وہ تو مر چکا ہے۔'' مجاہد قادری نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

''ہاں......! مر چکا ہے لیکن اس کا پلا تو زندہ ہے۔ جو گندگی مرنے سے پہلے پھیلا گیا ہے، وہی گندگی اب بساند مارنے لگی ہے۔ اس کا فوری تدارک ضروری ہے۔'' چوہدری جہانگیر نے کہا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بوڑھی عورت اور ایک چادر پوش لڑکی جو مکمل طور پر ایک سیاہ چادر میں لپٹی ہوئی تھی، ہال کمرے میں داخل ہوئیں اور ان کے پیچھے پیچھے دلاور بھی کمرے میں داخل ہوا جو سیدھا چوہدری

جہانگیر کے پاس آ کر رکا اور بولا۔

''چوہدری صاحب......! وہ لوفر گھر پر نہیں تھا، اس کی ماں اور بہن کو لے آیا ہوں۔''

''چل ٹھیک ہے......! یہ بھی ٹھیک ہے......!'' چوہدری جہانگیر نے کہا اور گہری نظروں سے ان دونوں کا جائزہ لیا جو مجرموں کی طرح سر جھکائے کمرے کے وسط میں کھڑی تھیں اور تقریباً اس وقت سبھی کی نظریں ان پر مرکوز تھیں۔

☆☆☆

ماہین اور راجو حسب معمول گندم کے کھیتوں کے بیچوں بیچ ایک درخت کے نیچے بیٹھے راز و نیاز میں مصروف تھے اور رات دھیرے دھیرے سرکتی جا رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے میں گم تھے۔ دو محبت بھرے دل محبت کی اس تان پر دھیمے سروں میں رقص کناں تھے۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر، تقدیر کی ہر کروٹ سے بے نیاز جیسے انہیں کسی کی کوئی پرواہ ہی نہ ہو۔ نہ دنیا کی، نہ سماج کی، نہ وقت کی اور نہ شاید تقدیر کی۔

لیکن تقدیر کے آگے تو کسی کی بھی نہیں چلتی۔ ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ اور اس وقت بھی ہونی نے اپنے ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ تقدیر نے ایک انوکھی، خطرناک اور بے رحم کروٹ لی تھی لیکن وہ دونوں اس سے لاعلم تھے۔

مولوی محمد شفیع کی سحر انگیز آواز کو انہوں نے معمول کی طرح سنا، دونوں ہی اپنی جگہ سے کھڑے ہوئے، راجو نے زمین پر بچھا کپڑا اٹھا کر جھاڑا اور پھر اپنے کندھے پر رکھ لیا۔

اس کے بعد راجو نے بازو پھیلائے اور ماہین اس کے بازوؤں کے قلعے میں سما کر اس کے چوڑے سینے پر اپنا سر رگڑنے لگی۔ راجو نے ماہین کی پیشانی کا بوسہ لیا اور پھر دونوں الگ ہو گئے۔

وہ دونوں سہانے خوابوں میں ڈوبے اپنے اپنے راستے پر جا رہے تھے۔ دو

مختلف راستوں پر۔ راجو نے روزانہ کی طرح اس پتلی پگ ڈنڈی کا انتخاب کیا جس پر سے ہوتا ہوا وہ اپنے گھر کی طرف جاتا تھا اور ماہین نے اس راستے کا انتخاب کیا جو نہر کے دوسرے پل پر سے ہوتا ہوا اس کے گھر کی طرف جاتا تھا۔

راستے میں آنے والی نہر ایک ہی تھی لیکن دونوں الگ الگ پل کراس کر کے یہاں تک پہنچتے تھے کیونکہ راجو کا گھر اگر مشرق تھا تو ماہین کا مغرب۔ اور وہ دونوں مشرق اور مغرب کو ملانے کا تہیہ کیئے ہوئے تھے۔

راجو نے جونہی پتلی پگ ڈنڈی عبور کی، کھیتوں کا سلسلہ یک لخت ختم ہوگیا۔ اب سامنے ہی نہر نظر آ رہی تھی جس کے دونوں اطراف میں گھنے اور قد آور درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا نظر آ رہا تھا۔ محبت کے نشے میں سرشار راجو کشاں کشاں ان درختوں کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ جونہی اس نے درختوں کے سلسلے کو کراس کیا۔ ایک درخت کے عقب سے وہ برآمد ہوا، وہی ہیولہ۔

رات کی تاریکی میں چلتے ہوئے پانچ افراد مکمل طور پر سیاہ لباس میں ملبوس تھے اور ان کے چہرے بھی چھپے ہوئے تھے۔ پانچوں سیاہ پوش آگے پیچھے چلتے ہوئے خاموشی سے گاؤں سے باہر جانے والے راستے کی طرف گامزن تھے۔

انہوں نے نہر کا پل کراس کرتے ہوئے اردگرد کا جائزہ گیا۔ ہر طرف مکمل خاموشی اور سناٹا تھا۔ ماحول پر عجب ہو کا عالم طاری تھا۔ پانچوں سیاہ پوش اب اونچے لمبے خاموش آسیب کی صورت کھڑے درختوں کے نیچے نہر کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے اور پھر شاید وہ اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ کچھ ہی فاصلے پر نہر کا ایک اور پل نظر آ رہا تھا لیکن وہ اس پل کی طرف جانے کی بجائے مختلف درختوں کی اوٹ میں غائب ہونے لگے اور اب یہاں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بالکل یوں جیسے ان جیتے جاگتے ہٹے کٹے پانچ آدمیوں کو ان آسیبی درختوں نے زندہ نگل لیا ہو۔

وقت اپنا سفر طے کرتا رہا اور پھر مولوی محمد شفیع کی آواز نے ہی اس گہری

خاموشی اور سناٹے کا دامن تار تار کیا۔
''نہیں ہے کوئی معبود مگر اللہ''

اور پھر کھیتوں کی طرف سے آتی ہوئی پگ ڈنڈی نے ایک سایہ اگل دیا۔ وہ سایہ بہ لمحہ درختوں کے قریب ہوتا جا رہا تھا اور پھر آخرکار وہ درختوں کے قریب پہنچ ہی گیا۔ جونہی وہ ایک درخت کے پاس سے گزرا، درخت کے عقب سے ایک سیاہ پوش برآمد ہوا جس کے ہاتھوں میں ایک گن تھی جسے سیاہ پوش نے نال کی طرف سے پکڑا ہوا تھا۔

سیاہ پوش کے دونوں ہاتھ بلند ہوئے اور پھر جس طرح بجلی کوند جاتی ہے، ٹھیک اسی طرح گن کا دستہ راجو کے سر سے ٹکرایا اور راجو زمین بوس ہوگیا۔ اب وہ بے حس و حرکت تھا۔ سیاہ پوش کی آواز بلند ہوئی۔

''دلاور......! فیضو......! جلدی آؤ......! اور فٹافٹ کام ختم کرو......!'' سیاہ پوش یقیناً رحیم دادا کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔

پھر درختوں نے ایک ایک کر کے انسان اگلنا شروع کئے تو درختوں کی اوٹ سے چار مزید لوگ نکل آئے۔ جو تیزی سے زمین پر پڑے ہوئے راجو کی طرف بڑھے۔ دلاور نے جلدی جلدی ایک رسی نکالی اور راجو کے ہاتھ پیر باندھا شروع کر دیئے جبکہ فیضو اور اس کے ساتھی ایک بوری نکال کر اس میں کھیت سے مٹی بھرنے لگے۔

پھر چند لمحوں کے بعد ہی سب لوگ پل کی طرف جا رہے تھے۔ اس طرح کہ رحیم دادا اور دلاور نے راجو کو اٹھا رکھا تھا جبکہ فیضو اور اس کے ساتھیوں نے مٹی کی بوری...... پل پر پہنچ کر فیضو نے جلدی جلدی بوری کا منہ رسی سے باندھا اور رسی کا دوسرا سرا راجو کی کمر کے گرد لپیٹ دیا گیا۔ پھر ایک لمبی رسی راجو کی کمر سے لپیٹ کر جس کا دوسرا سرا گچھے کی شکل میں پل پر پڑا تھا۔ اور اس کے بعد راجو اور مٹی کی بوری ایک ساتھ چھپاکے کی آواز کے ساتھ نہر میں گرے اور پانی میں

غائب ہو گئے۔

ایک منٹ...... دو منٹ...... اور پھر تقریباً پچیس منٹ کے انتظار کے بعد انہوں نے رسی کے اس گچھے کی طرف توجہ دی اور پھر وہ سب مل کر رسی کھینچ رہے تھے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد راجو ایک مرتبہ پھر ان کے سامنے تھا۔ انہوں نے جلدی جلدی سب رسیاں کھول کر الگ کیں۔

فیضو اور اس کے ساتھیوں نے بوری نہر میں پلٹ کر اس طرح جھاڑی کہ ساری مٹی نہر میں گر گئی۔ ساری رسیاں لپیٹ کر خالی بوری میں ڈالی گئیں جبکہ راجو کو دوبارہ ایک چھپاکے کی آواز کے ساتھ پانی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

دور کھیتوں میں کہیں ریڈیو چل رہا تھا اور ہوا کے دوش پر گلوکار کی آواز آ رہی تھی۔ جو گنگنا رہا تھا۔

تیرا میرا ساتھ بھی ہوگا
اور ہاتھوں میں
ہاتھ بھی ہوگا
پیار کے پنچھی
چہک اٹھیں گے
اور وہ لمحے
مہک اٹھیں گے
تب رم جھم
برسات بھی ہوگی
اپنے ملن کی رات بھی ہوگی
آنکھ کھلی تو خود سے بولے
او پاگل دیوانے شاعر
دل میں پیار نہ رکھا کر

اتنے خواب نہ دیکھا کر

☆☆☆

پھر چوہدری جہانگیر نے ہی کمرے میں چھائی ہوئی خاموشی کا سینہ چاک کیا جو مولوی محمد شفیع سے مخاطب تھا۔

''مولوی صاحب......! آپ تو دیندار آدمی ہو۔ آپ بتائیں کہ کسی کو ضرر پہنچانے، ایذا پہنچانے یا کسی کے جان و مال کا نقصان کرنے والے کے لئے اسلام کیا فیصلہ کرتا ہے......؟''

مولوی محمد شفیع جن کے ہاتھ مسلسل تسبیح کے دانے اوپر نیچے کر رہے تھے، چوہدری جہانگیر کی آواز سن کر ساکت ہو گئے اور پھر کھنکھار کر جیسے انہوں نے گلا صاف کیا۔ اس کے بعد گویا ہوئے۔

''چوہدری صاحب......! اسلام ایک مکمل دین ہے۔ ایک مکمل ضابطہ حیات اور اس میں کسی امیر کو کسی غریب پر کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ کسی بڑے کو کسی چھوٹے پر کسی طرح کا کوئی ظلم روا رکھنے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام میں واضح طور پر یہ بات ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلے کان اور جان کے بدلے جان، تا آنکہ مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف نہ کر دیں۔''

''تو مولوی صاحب......! جواب دیں۔ اسلام میں عزت کے بدلے کا کیا فیصلہ ہے......؟'' چوہدری جہانگیر کی غراتی ہوئی آواز بلند ہوئی تو سب جیسے چونک اٹھے۔ چوہدری جہانگیر کی کرخت آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

''مولوی صاحب......! اس بڑھیا کے غلیظ پلے نے اس لڑکی کے کمینے بھائی نے میری عزت پر ہاتھ ڈالا ہے۔ میری پھول جیسی بیٹی کو......''

چوہدری جہانگیر کی آواز۔ پھٹنے لگی تو وہ خاموش ہو کر لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ اس کے نتھنے بری طرح پھول اور پچک رہے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

جس سے یہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اس وقت شدید غصے میں ہے۔

چوہدری جہانگیر کی یہ بات سن کر وہاں موجود سب لوگوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا اور مولوی محمد شفیع کا چہرہ یوں سفید پڑ گیا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہ نکلے۔ جبکہ چوہدری جہانگیر کے پانچوں بیٹوں کی کیفیت بھی اس وقت باپ سے کچھ مختلف نظر نہیں آ رہی تھی۔ ان کے چہرے بھی لال بھبھوکا ہو رہے تھے اور وہ وحشیانہ نظروں سے دونوں خواتین کو گھور رہے تھے۔

پھر چند لمحوں کے توقف سے چوہدری جہانگیر کی ہڈیوں کو ٹھٹھرا دینے والی سخت لیکن سرد آواز بلند ہوئی۔

''آنکھ کے بدلے آنکھ...... ناک کے بدلے ناک...... کان کے بدلے کان...... جان کے بدلے جان...... تو عزت کے بدلے عزت ہی ہوئی نا مولوی صاحب......!'' لیکن مولوی صاحب کوئی جواب نہ دے سکے۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ تسبیح کے دانوں پر ان کی انگلیاں مزید تیزی سے چلنے لگیں۔

''یاسر......! قیصر......! لے جاؤ اس لڑکی کو اور اس کی عزت کی دھجیاں اڑا دو تاکہ آئندہ کسی بھی نیچ انسان کو اپنے سے بڑی حیثیت کے آدمی کی عزت پر ہاتھ ڈالنے کا موقع نہ ملے...... لے جاؤ......!'' چوہدری جہانگیر کی زور دار دھاڑ بلند ہوئی۔ جس کے نتیجے میں چوہدری جہانگیر کے پانچوں بیٹے بھوکے بھیڑیوں کی طرح چادر میں لپٹی ڈری سہمی زہرہ پر ٹوٹ پڑے۔

''لیکن چوہدری صاحب......!'' مولوی صاحب کی پھنسی پھنسی آواز بلند ہوئی تو رحیم دادا اور دلاور کی بندوقوں کا رخ پنچائت کے حاضرین کی طرف ہو گیا۔ نتیجتاً مولوی صاحب اس سے آگے کچھ کہنے کی جرأت نہ کر سکے۔

چوہدری جہانگیر کے پانچوں بیٹے وحشی درندوں کی طرح روتی بلکتی زہرہ کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے تھے۔ شیطان دل کھول کر قہقہے لگا رہا تھا لیکن اسلام مولوی صاحب کے روپ میں بندوقوں کے سامنے خاموش تماشائی بنا بیٹھا حوا کی

بیٹی پر ہونے والے ظلم کی انتہا کو دیکھ رہا تھا۔ زہرہ کی ماں دوڑ کر چوہدری جہانگیر کے قدموں سے لپٹ گئی۔

''چوہدری......! یہ ظلم نہ کر......تو بھی ایک بیٹی کا باپ ہے...... دیکھ میری زہرہ بھی تیری بیٹیوں جیسی ہے...... تجھے خدا کا واسطہ چوہدری......! یہ ظلم نہ کر...... زہرہ کو چھوڑ دے...... میں زہرہ اور راجو کو لے کر یہ گاؤں ہی چھوڑ دوں گی...... پھر کبھی نظر نہیں آئیں گے ہم لوگ...... اللہ اور رسول کے واسطے میری بیٹی کو چھوڑ دے۔''

وہ بلک بلک کر رو رہی تھی لیکن چوہدری جہانگیر تو جیسے بہرہ ہو چکا تھا اور چوہدری کے پانچوں بیٹے زہرہ کے ساتھ کمرے سے جا چکے تھے۔ زہرہ کی ماں اب چوہدری کے سامنے سے اٹھ کر وہاں موجود ایک ایک شخص کے پاؤں پکڑ رہی تھی، فریاد کر رہی تھی۔

''ارے......! کوئی تو میری بیٹی کو بچاؤ......! تمہیں رب کا واسطہ......!'' پھر وہ بھاگ کر مولوی محمد شفیع کے قدموں سے جا لپٹی۔

''مولوی صاحب......! میری بیٹی کو بچاؤ ورنہ اللہ کو کیا منہ دکھاؤ گے......؟''

لیکن مولوی صاحب منہ ہی منہ میں کچھ بدبدا رہے تھے اور تسبیح پر ان کی انگلیاں مزید تیز رفتاری سے چل رہی تھیں۔

ٹھیک اسی وقت زہرہ کی ایک دلخراش چیخ سنائی دی۔ طویل اور کرب ناک چیخ۔ زہرہ کی ماں تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن وہ کھڑی نہ رہ سکی۔ ایک ہاتھ سینے پر رکھے وہ تیورا کر نیچے گری اور ساکت ہوگئی۔ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

شاید اس سے زیادہ ذلت، اس سے زیادہ رسوائی برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ لیکن اس کی کھلی ہوئی مردہ آنکھیں اب بھی فریاد کناں تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں۔

''ارے......! کوئی تو میری بیٹی کو بچاؤ......! کوئی تو......''

☆☆☆

زہرہ کے گھر کا وہ کمرہ اس وقت کسی چھوٹے موٹے اسپتال کا منظر پیش کر رہا تھا۔ ایک چارپائی پر زہرہ لیٹی ہوئی تھی جو شاید ہوش و خرد سے بے گانہ تھی۔ اسے گردن تک سفید کپڑے سے ڈھانپا گیا تھا۔ قریب ہی ایک اسٹینڈ پر لٹکی ہوئی ڈرپ تھی، ایک چھوٹی تپائی کے اوپر میڈیکل باکس کھلا پڑا تھا۔ ڈاکٹر عدیل ڈرپ میں کوئی انجکشن انجیکٹ کر رہا تھا۔ اور اس وقت اسے کہیں پڑھا ہوا یہ شعر یاد آ رہا تھا۔

شکستہ منظروں کی کرچیاں آنکھوں میں چبھتی ہیں
کہ دیوانوں کے خوابوں کو کہاں تعبیر ملتی ہے

خواب ہی تو دیکھے تھے اس نے...... سندر، نازک اور محبت بھرے خواب۔ ابھی تو صرف اس کے دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔ ابھی تو اس کی پلکوں نے خواب پرونا ہی سیکھے تھے کہ......

ٹھیک اسی وقت زہرہ کے کراہنے کی آواز سے عدیل کی سوچوں کا شیرازہ منتشر ہوگیا اور وہ چونک کر زہرہ کی طرف متوجہ ہوگیا۔ لیکن زہرہ کی آنکھیں بدستور ندتھیں لیکن اب اس کا زرد اور کملایا ہوا چہرہ عین عدیل کی آنکھوں کے سامنے تھا ور وہ خاموش چہرہ جیسے عدیل کی محبت کا اس کے جذبوں کا مذاق اڑا رہا تھا۔

یہ تو پہلے ہی کہا تھا کہ مرے خواب نہ چن
میں ستاروں کی طرح قابل تسخیر نہیں

عدیل نے سر جھٹکتے ہوئے اپنے آپ کو سنبھالا اور ڈرپ کی طرف متوجہ گیا۔ گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے ڈرپ کی اسپیڈ ہلکی سی بڑھائی اور پھر تپائی کے تھ رکھی کرسی پر ڈھے سا گیا۔

وہ گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں سے یہیں موجود تھا۔ اس دوران راجو کی لاش بھی یافت کی جا چکی تھی اور زہرہ کی امی اور راجو کی تدفین بھی کی جا چکی تھی۔ جب وی محمد شفیع نے ڈسپنسری آ کر ڈرتے، جھجکتے ساری بات عدیل کو بتائی تھی تو اسے

اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ اس کے اندر کوئی چیز جیسے چھن سے ٹوٹ گئی تھی، کرچی کرچی، ریزہ ریزہ ہوگئی تھی اور وہ بے بسی سے مولوی محمد شفیع کا چہرہ دیکھتا رہ گیا تھا۔

مولوی محمد شفیع ہی نے بتایا تھا کہ زہرہ کی ماں کا انتقال ہوگیا اور زہرہ کے روپ میں حوا کی بیٹی لٹ گئی جس کو زخم زخم بے ہوشی کی حالت میں ماں کی میت کے ساتھ اس کے گھر پہنچا دیا تھا۔ عدیل نے اپنی مری مری شکستہ آواز میں صرف ایک جملہ کہا۔

''مولوی صاحب......! یہ سب کچھ آپ کی موجودگی میں، آپ کی آنکھوں کے سامنے ہوا اور آپ کچھ نہیں بولے......؟'' لیکن مولوی صاحب کے جواب کے بعد عدیل نے ان سے ایک لفظ نہیں کہا۔

مولوی صاحب کہہ رہے تھے اور ساتھ ساتھ زار و قطار رو رہے تھے۔

''بیٹا......! میں بہت شرمندہ ہوں۔ اللہ کو جان دینی ہے۔ میری اس چشم پوشی پر پتا نہیں اللہ بھی مجھے معاف کرے گا یا نہیں...... لیکن میں بوڑھا ناتواں آدمی کر بھی کیا سکتا تھا......؟ ان درندوں کے سامنے مجھ مجہول انسان کی حیثیت ہی کیا بیٹا......! اور پھر میری بھی چار جوان بیٹیاں ہیں۔ میری آنکھوں کے سامنے وہ شیطانیت آمیز، انسانیت سوز گھناؤنا کھیل کھیلا گیا لیکن میں کچھ نہیں کر سکا بیٹا......! کچھ بھی نہیں......! میرا اللہ مجھے معاف کرے......!''

مولوی صاحب روتے ہوئے ڈسپنسری سے باہر نکل گئے۔ لیکن عدیل...... اسے تو جیسے سکتہ ہوگیا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں سی چل رہی تھیں لیکن جو ہونا تھا، وہ تو ہو چکا تھا۔

چند لمحوں کے بعد عدیل نے جھرجھری سی لی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ضروری دوائیں سمیٹ کر بیگ میں رکھیں۔

ماں بیٹے کے جنازے میں بہت کم لوگ شریک ہوئے تھے۔ پتا نہیں

چوہدری جہانگیر کا خوف تھا یا ان لوگوں کو گاؤں والے زیادہ پسند نہیں کرتے تھے۔ جو بھی ہو، دونوں کی تدفین بہرحال ہوگئی تھی۔

عدیل گزشتہ اڑتالیس گھنٹوں سے مسلسل جاگ کر زہرہ کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ اس دوران دو مرتبہ زہرہ کو ہوش آ چکا تھا۔ پہلی مرتبہ تو بری طرح سے چیختے ہوئے اور اپنے آپ کو کسی غیر مرئی گرفت سے بچانے کی کوشش کرتے ہوئے، عدیل کے لاکھ کوشش کرنے پر بھی جب اس کی حالت نہ سدھری تو مجبوراً عدیل نے اسے بے ہوشی کا انجکشن دے دیا۔

البتہ دوسری مرتبہ ہوش آنے پر اس کی کیفیت قدرے بہتر تھی۔ اس مرتبہ اس نے جنونی حرکات تو نہیں کیں، البتہ وہ دل کھول کر روئی تھی اور عدیل نے بھی اسے رونے دیا۔

پھر کچھ دیر کے بعد عدیل نے ہمت کی اور اٹھ کر زہرہ کی چارپائی پر جا بیٹھا اور زہرہ کی اشک بار آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

''زہرہ......! راجو اور تمہاری امی جان اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔'' اور زہرہ ایک مرتبہ پھر بلک بلک کر رو دی۔ عدیل نے مزید کچھ دیر تک اسے رونے دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں کے ہالے میں زہرہ کا چہرہ تھام کر بولا۔

''لیکن زہرہ......! تم تنہا نہیں ہو...... میں ہوں نا تمہارے ساتھ......؟ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی اور پھر میں تمہیں یہاں سے، اس گاؤں سے بہت دور لے جاؤں گا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ زہرہ......! تم یقین کرو میں تمہیں اتنی محبت دوں گا، اتنی محبت دوں گا کہ تم اپنے یہ دکھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بھول جاؤ گی۔'' عدیل بول رہا تھا اور زہرہ کے آنسو منجمد ہو گئے تھے۔

''جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا، یہ جذبے اسی وقت میرے دل میں جاگ گئے تھے۔ کاش میں تم سے اسی وقت کہہ دیتا لیکن افسوس کہ...... خیر چھوڑو...... پہلی مرتبہ میں تمہاری امی جان کا علاج کرنے آیا تھا اور آج دوسری

مرتبہ تمہارا...... ڈاکٹر ہوں نا......؟ لیکن اب ایسی نوبت ہی نہیں آئے گی۔ کیونکہ میں ہمیشہ کے لئے تمہیں یہاں سے لے جاؤں گا۔ میں تمہیں یہاں رہنے ہی نہیں دوں گا۔''

عدیل اپنی ہی دھن میں بے تکان بولے چلا جا رہا تھا اور زہرہ اپنی طرز کے اس انوکھے انسان کو اشک بار آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔

کتنی محبت، اپنائیت، دیوانگی، والہانہ پن تھا اس کے انداز میں۔ کیسا دیوانہ شخص تھا یہ بھی۔ زہرہ کی بے بس، اداس آنکھیں اس منفرد انسان کا طواف کر رہی تھیں لیکن بڑا ہی درد، بڑی ہی بے چارگی تھی ان آنکھوں میں جیسے کہہ رہی ہوں کہ

میرے زخموں کی کہیں، کوئی بھی، اکسیر نہیں
میں ہوں وہ خواب کہ جب خواب کی تعبیر نہیں

لیکن اس کی زبان عدیل سے ایسا بھی نہ کہہ سکی۔ عدیل نے اسے نیند کا انجکشن لگا دیا اور اس کی پلکیں جھکتی چلی گئیں۔

جس دن عدیل اسے لے کر شہر کی طرف جا رہا تھا، اس دن وہ سب کچھ بھول چکا تھا۔ گاؤں...... گاؤں کی ڈسپنسری، دکھی انسانیت کی خدمت، سب کچھ...... بھلا اس خدمت نے اسے دیا ہی کیا تھا......؟ دکھ، اذیت اور ایسا کرب جس نے اس کی روح تک زخمی کر ڈالی تھی اور زہرہ...... زہرہ اس کی روح ہی تو تھی جسے بنا کسی جرم کے زخم زخم کر دیا گیا۔

ایک وہ تھا کہ جس نے خواب ہی تو دیکھے تھے لیکن اس کے خواب چکنا چور کر دیئے گئے۔ ریزہ ریزہ کر دیئے گئے تھے۔ لوٹ لیے گئے تھے۔ اور اب وہ مزید اپنے خوابوں کے لٹنے کا، ان کے ٹوٹ کر بکھرنے کا دکھ نہیں جھیل سکتا تھا، اس لئے زہرہ کے ساتھ ساتھ آج عدیل نے بھی اس گاؤں کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔ دونوں قدم سے قدم ملائے چلے جا رہے تھے۔ کسی نئی دنیا نئی منزل کی طرف۔

وہ اس گاؤں میں انسانیت کی خدمت کرنے آیا تھا مگر وہاں کے لوگ بے حس تھے۔ انہیں خود اپنے انسان ہونے کا احساس نہیں تھا تو وہ دوسروں کا کیا خیال کرتے......؟ سو اس نے اس گاؤں کو چھوڑ دیا تھا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے۔

☆☆☆

چوہدری جہانگیر کی حویلی اس وقت دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ رنگ برنگی جھنڈیاں، غبارے، رنگ برنگی جھلمل جھلمل کرتی لائٹیں، حویلی کے باہر کیلے کے درختوں کو گاڑ کر دروازے سے بہت پہلے ایک اور دروازہ بنا دیا گیا تھا۔ بے شمار گاڑیاں قطار در قطار کھڑی ہوئی تھیں جبکہ حویلی مہمانوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔

بہت سے باوردی ویٹر ادھر سے ادھر گردش کرتے پھر رہے تھے اور ایک عجیب ہاؤ ہو کا سماں تھا جسے دیکھ کر یہ اندازہ لگانا ذرا بھی مشکل نہیں تھا کہ آج حویلی میں کوئی رنگا رنگ تقریب منعقد کی جا رہی تھی۔

ادھر مہمان انواع و اقسام کے کھانوں سے ضیافت اڑا رہے تھے، ادھر حویلی کے اندرونی حصے میں لڑکیاں بالیاں گھیرا ڈالے ماہین کے اردگرد بیٹھی تھیں جو اس وقت دلہن کے لباس میں بنی سنوری بیٹھی قیامت ڈھا رہی تھی۔

سب خوش تھے، ہر طرف قہقہے تھے لیکن ماہین کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ اس کے خوابوں کا حکمران اس کا شہزادہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ زہرہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ماں کا جو انجام ہوا، سب اس کے علم میں آ گیا تھا۔ اس کی سکھی ناہید نے تو یہ تک خدشہ ظاہر کر دیا گیا تھا کہ راجو کی موت نہر میں ڈوبنے سے نہیں ہوئی۔ ایسا لگتا ہے کہ اسے بھی مروا دیا گیا ہے اور ماہین...... ماہین کو بھی تو بری طرح زدوکوب کیا گیا تھا۔

اس کے واویلا کرنے پر، شور مچانے پر اس کے بھائیوں نے باپ کے سامنے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ تھی تو آخر ایک کمزور لڑکی نا......

کہاں تک مقابلہ کرتی......؟ اور کس کے لئے کرتی......؟ جس کے لئے پوری دنیا سے ٹکرا جانے کا عزم کیا تھا، ساتھ جینے ساتھ مرنے کا عہد کیا تھا، وہی نہ رہا تو کیا کرسکتی تھی وہ......؟ ساتھ جی نہ سکی تو ساتھ مر کیسے سکتی تھی......؟ اور پھر حقیقت کتنی کڑوی کتنی تلخ ہوتی ہے، اس کا اندازہ تو حقیقت میں رہتے ہوئے ہی لگایا جا سکتا ہے نا......! فلموں، ڈراموں اور کہانیوں کی بات اور ہے، حقیقت بڑی مختلف ہوتی ہے اور اس نے حقیقت سے سمجھوتہ کرلیا تھا، کرنا ہی تھا، اور کر بھی کیا سکتی تھی......؟

خواب کتنے ہی سہانے کیوں نہ ہوں......؟ ایک دن آنکھ تو کھلتی ہی ہے اور جب آنکھ کھلتی ہے تو ان سندر خوابوں کے ٹوٹنے کا بڑا دکھ ہوتا ہے۔ بڑی اذیت ملتی ہے۔ خواب دیکھنا بری بات نہیں، ہاں خوابوں میں رہنا بہت بری بات ہے۔ اور ہمیشہ یہی ہوا ہے جب کبھی کسی نے اپنے خواب کو تعبیر دینے کی کوشش کی تو پاؤں لہولہان ہوگئے ہیں اور دامن میں پچھتاوؤں کی دھول، خسارے کی راکھ اور ندامت کے آنسوؤں کے علاوہ کچھ باقی نہیں بچتا۔

ماہین کے خیالات کا تسلسل اس وقت ٹوٹا جب ایجاب وقبول کا وقت آیا۔ ماہین کو رخصت کر دیا گیا۔ وہ بہت سی یادیں، بہت سے دکھ دامن میں سمیٹے اس گھر، اس گاؤں، اس خونی نہر سے، گندم کے ان کھیتوں سے دور، بہت دور ایک نئے سفر پر جانے کے لئے اپنے جیون ساتھی کے پہلو میں بیٹھی تھی۔

گاڑیاں اسٹارٹ ہوئیں اور اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوگئیں۔ ماہین کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے آنسو ٹپکے جو اس کے گالوں پر سے ہوتے ہوئے کہیں غائب ہوگئے۔ شاید اپنی زندگی، شاید راجو کی زندگی یا شاید اپنے خوابوں کے اس ادھورے پن پر...... ان آنسوؤں کے گرتے ہی اس نے خود سے ایک عہد کیا۔ راجو کو بھولنے کا عہد۔

ادھورے خواب......!

آنکھوں میں سجا کر

جئیں کیا......؟
مر نہیں سکتے
کبھی ہم......!
حدوں کے درمیاں
پابند رہ کر
محبت کر نہیں
سکتے کبھی ہم......!
چلو ایک دوسرے کو
بھول جائیں

☆☆☆

وقار عظیم پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

بخت آور

بہت دنوں کے بعد آج بختاور کے چہرے پر سچی خوشیوں کے دھنک رنگ بکھرے تھے۔

سینکڑوں کہانیوں کے مرکز و محور ''تھل'' کے ایک دور افتادہ گاؤں میں بختاور رہتی تھی۔ تھل...... جہاں غربت تھی، بھوک تھی، جہاں آندھیوں کے جھکڑ چلتے تھے تو چاروں طرف ریت کی دیوار سی کھڑی ہو جاتی تھی۔ راتوں میں چمکتی ہوئی چاندنی، جھلملاتے ستارے، ٹھنڈی ہوائیں، صحرا پر پرواز کرتے صحرائی جہاز جن کے گلے میں بندھی کھنکھناتی ہوئی گھنٹیاں، کانوں کو بہت بھلی لگتی تھی۔

وہ تھل...... جس نے سسی کو جنم دیا، جس نے پنوں کی دیوانگی کے مناظر دیکھے، جہاں کی فضاؤں میں آج بھی روایتی لوک گیتوں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

لگی والیاں نوں نیندنئیں اوندی
تیری کیوں نی اکھ لگ گئی
رات چانن تے اڈدا چکورسی
روندا پیا روچ پیلاں پاندا مورسی
ڈاروں وچھڑ کے کونج کرلاوندی

تیری کیویں نی اکھ لگ گئی
(محبت کرنے والوں کو نیند نہیں آتی
تمہاری آنکھ کیسے لگ گئی
چاندنی رات تھی اور چکور اڑ رہا تھا
اور پیار میں ایک ناچتا ہوا مور رو رہا تھا
جس طرح اپنی قطار، اپنی ہم جولیوں سے بچھڑ کر کونج کرلاتی ہے)

وہی تھل آج بچشم حیراں بختاور کے معصوم چہرے پر کھلتی ہوئی خوشیوں کے رنگ دیکھ رہا تھا۔ بختاور کا باپ مٹی کے برتن اونٹ پر لاد کر گاؤں گاؤں بیچنے جاتا تھا اور بختاور جب مٹی سے جنگ لڑتی تھی تو اس کے جسم سے بہتا مشقت کا پسینہ مٹی کی سوندھی خوشبو میں مدغم ہو جاتا اور وہ مٹی انمول ہو جاتی لیکن وہی مٹی بختاور کا باپ بخشو پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے انتہائی معمولی قیمت پر بیچ آتا۔

سسی کی وہی سرزمین تھی اور آج بختاور کے چہرے پر کھلتے ہوئے رنگ کسی اور سسی کے ظہور کی پیش گوئی کر رہے تھے۔ کسی اور کہانی، کسی اور المیے کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ تھل کے چھوٹے بڑے دیہاتوں میں گونجتی سسی کی لافانی داستان اور اس کا انجام بارہا بختاور کی سماعتوں نے بھی سنا لیکن پھر بھی وہ اپنے معصوم دل سے پھوٹتے جذبوں کے آگے کوئی بند نہ باندھ سکی۔ کوئی دیوار کھڑی نہ کر سکی اور غلام حسین سومرو کے گھر آنے والے مہمان، اس شہری نوجوان صارم کو اپنے من مندر کا دیوتا بنا بیٹھی۔

وہ تھا ہی ایسا......! اونچا، لمبا، مکمل، مضبوط کڑیل جوان جو چلتا تو لگتا کائنات تسخیر کر لے گا پھر بھلا اس کا دل کیوں نہ تسخیر کر لیتا۔ اس کے معصوم دل کی بساط ہی کیا تھی؟ گاؤں کی گلیوں میں آتے جاتے، گھومتے پھرتے جب بھی اس کی نظر بختاور پر پڑتی تو اسے خود پر اس کی نظروں کی گرمی کا احساس ہوتا اور وہ خود میں سمٹ کر رہ جاتی۔

اگر صارم کی نظریں اس کا تعاقب کرتی تھیں تو اس میں اس کا قصور بھی نہ تھا۔ پورے گاؤں میں بختاور جیسی کوئی دوسری لڑکی تھی بھی تو نہیں......؟

نرم و نازک، تیکھے نقوش کی مالک بختاور ہرنی جیسی آنکھوں میں کبھی کاجل لگا لیتی تو صارم کو اپنی دنیا ان آنکھوں میں ڈوبتی محسوس ہوتی۔ اس کی صرف آنکھیں ہی ہرنی جیسی نہ تھیں، وہ خود بھی ایک معصوم ہرنی ہی لگتی تھی۔ اپنے غول سے بچھڑی ہوئی ہرنی۔ سہمی ہوئی، خوف زدہ سی، اپنی ڈار سے بچھڑی ہوئی کوئی کونج......

محبت جب دلوں میں پھوٹتی ہے تو کسی چشمے، کسی آبشار کی مانند انسان کو اپنے ساتھ بہاتی ہوئی لے جاتی ہے۔ سرد و گرم، اونچ نیچ، پورب پچھّم، زمین آسمان، امیری غریبی، ہر چیز سے بے نیاز آگے ہی آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اور انسان اس کے زور کے آگے بے بس ہو کر رہ جاتا ہے۔

پھر بختاور کیسے بچ پاتی، پانی کا ایک قطرہ مسلسل اگر کسی پتھر یا پہاڑ پر بھی گرتا رہے تو اس میں سوراخ کر دیتا ہے۔ وہ تو ایک نرم نازک دل رکھنے والی جیتی جاگتی لڑکی تھی۔

صارم کی نظروں کی حدت نے اسے آخر پگھلا ڈالا اور اس کی دھڑکنیں نئے راستے کے سفر سے آشنا ہونے لگیں۔ ان راستوں پر جن کی کوئی منزل نہیں ہوتی۔

صحرا کی ایک خاموش، پرسکون اور سحر انگیز رات، جب ریت کے سر جوڑ کر بیٹھے دو ایسے ٹیلوں کے درمیان بختاور اور صارم پہلی بار ملے، ٹیلے آپس میں یوں مدغم تھے جیسے ان کی چھاؤں میں بیٹھے ہوئے دو محبت بھرے وجود...... وہ لمحے یاد کر کے اب بھی بختاور کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو رہی تھیں جب اپنی سکھی مومل کے گھر جاتے ہوئے گلی کے کونے میں صارم نے اس کا آنچل پکڑ کر روکا تھا اور کہا تھا۔

''بختاور......! میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں لیکن اس کا موقع نہیں مل پا رہا۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کر سکو تو مجھے آج رات گاؤں کے باہر ان دو ٹیلوں کے سنگم پر ملو جو اس طرف آتے ہوئے میلوں دور سے نظر آنے لگتے ہیں۔'' بختاور کا دل

اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ اس کی دھڑکنیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور آنچل کھینچ کر صارم کی گرفت سے آزاد کروا لیا۔ وہ تیز رفتاری سے اپنے راستے پر چلی اور صارم کی آواز نے اس کا تعاقب کیا۔

''چاند نکلنے پر میں انتظار کروں گا، اگر تم نہیں آئیں تو ساری رات وہیں بیٹھا رہوں گا۔'' بختاور کا دل دھک سے رہ گیا لیکن وہ رکی نہیں۔ گھر آنے کے بعد بھی چاند نکلنے تک وسوسے، واہمے، خدشات اور محبت کے سندمد جذبوں کے درمیان ایک جنگ جاری رہی۔ یہ فیصلہ اس کے لئے پل صراط پر چلنے کے برابر تھا۔ عقل کہتی تھی۔

''نہیں......! مت جاؤ......!'' دل کہتا تھا۔

''مل لینے میں کیا حرج ہے......؟ سن تو لو وہ کیا کہتا ہے......؟'' دل اور عقل کی اس جنگ میں دماغ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ عقل پسپا ہو گئی اور وہ انوکھا جذبہ جیت گیا جس کی بختاور کو ابھی تک خود سمجھ نہیں آئی تھی کہ یہ کون سا جذبہ ہے جو اندر ہی اندر اس کے وجود کو تسخیر کرتا جا رہا ہے۔ نتیجتاً وہ اس وقت صارم کے ساتھ بیٹھی تھی اور صارم وارفتگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کی دلی مراد جو بر آئی تھی۔ اسے بختاور کے یوں چلے آنے کا یقین تو نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اپنے کہنے کے مطابق اس کا انتظار کرنے پر مجبور تھا اور بختاور کا آ جانا اس کی جیت ہی تو تھی۔ وہ جذبات سے مرتعش آواز میں بولا۔

''بختاور......! یہ سچ ہے کہ ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے انسان ہیں، شہر کا رہن سہن اور گاؤں کے رسم و رواج، دو متضاد چیزیں ہیں لیکن دنیا میں اس سے بڑا سچ کوئی نہیں ہوگا کہ میرے پاس میری سچائیوں کا ثبوت اس ایک جملے کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ ''مجھے تم سے محبت ہے'' اور یہ وہ جملہ ہے جس کے آگے سوچوں کی اڑان ہانپ جاتی ہے۔ لفظ بے اثر ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کے بعد آنکھیں باتیں کرتی ہیں، دھڑکنیں سماعت بن جاتی ہیں اور ہوائیں گیت گاتی ہیں۔

نظریں اٹھا کر دیکھو یہ آسمان، یہ چمکتا ہوا چاند، یہ جھلملاتے ستارے میری محبت کے گواہ ہیں اور میں ان سب کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں زندگی کی آخری سانس تک صرف تم سے محبت کروں گا۔ تمہارے بغیر جینا میرے لئے یوں ہے جیسے پانی کے بغیر مچھلی، جیسے پھول کے بنا خوشبو...... جو کچھ میں آج تم سے کہہ رہا ہوں شاید دوبارہ نہ کہہ پاؤں اور میں سمجھتا ہوں دوبارہ اس کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی کیونکہ جو کہا ہے وہ آج کے بعد کر کے دکھاؤں گا۔ تمہیں پانے کے لئے میں ہر قربانی دے سکتا ہوں۔ کیا میں امید رکھوں کہ تم میری محبت کا جواب محبت سے دو گی......؟''

بختاور کے ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔ اس نے بولنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہ دے پائے۔ اتنی سحر انگیز گفتگو کا جواب بھلا وہ دے بھی کیا پاتی......؟ وہ اس کے الفاظ کے جادو میں ڈوبتی چلی گئی۔

''بولو بختاور......! جواب دو......! کیا تم میرے دامن میں اپنی محبت کی خیرات نہیں ڈال سکتیں......؟'' بختاور نے بے اختیار تڑپ کر اس کے ہونٹوں پر ہاتھ رکھ دیا اور جذبات سے مغلوب آواز میں بولی۔

''نہیں صارم......! ایسے تو نہ کہیں۔ محبت تو مان ہوتی ہے، خیرات نہیں۔''

اور صارم کا دل خوشی سے ناچ اٹھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر بختاور کو کندھوں سے تھام کر کہا۔

''تو کیا تمہارا جواب ہاں میں ہے......؟'' اور بختاور کی لمبی گھنی پلکوں کے ریشمی غلاف شرمگیں انداز میں جھکتے چلے گئے۔ تھل کی ہوائیں نغمہ سرا تھیں۔ ستارے مسکرا رہے تھے اور ٹھنڈی یخ بستہ ریت ان کے قدموں تلے بچھی جا رہی تھی لیکن اس سے بڑی تلخ حقیقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہی ریت جب اپنی آنکھیں بدلتی ہے تو چاند کے ساتھ اپنی وفاداریاں بھی تبدیل کر لیتی ہے۔

اس وقت صرف اور صرف آگ برساتے سورج کی کنیز بن کر رہ جاتی

ہے۔ عشق، محبت، پیار، وفا سب جذبوں کو جھلسا کر رکھ دیتی ہے۔ جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ یہ ریت، بڑی طوطا چشم ہے، یہ تھل بڑا ظالم ہے۔ لیکن معصوم بختاور اس بات سے یکسر بے خبر تھی۔

بھلا ریگستانوں سے بھی چشمے پھوٹ سکتے ہیں؟ وہ پگلی یہ نہیں جانتی تھی کہ صحرا میں چشمے تلاش کرنے والوں کے حصے میں سراب کے علاوہ کچھ نہیں آتا۔ لیکن جو بھی تھا اس وقت تھل کے خاموش صحرا سے محبت کا چشمہ پھوٹ نکلا تھا اور وہ اس میں نہا کر رہ گئی تھی۔

آج اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کے اندر ہی اندر جو جذبہ پروان چڑھ رہا تھا وہ کچھ اور نہیں تھا، وہ محبت تھی۔ اور اس کی محبت کوئی معمولی محبت نہیں تھی۔ اس کی محبت تھل کا پیاسا صحرا تھی اور صارم اس کے لئے ٹھنڈا، میٹھا چشمہ۔ وہ اس سے گریز کر ہی نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

سن چرخے دی مٹھی کوک
ماہیا مینوں یاد آنودا
میرے دل وچوں اٹھ دی اے ہوک
ماہیا مینوں یاد آنودا

(چرخہ چلنے کی میٹھی آواز سن کر
مجھے ماہی یاد آتا ہے
تو میرے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے
مجھے ماہی یاد آتا ہے)

بخشو کے ہاتھ ماہرانہ انداز میں چاک پر حرکت کر رہے تھے اور مٹی اپنی شکل لمحہ بہ لمحہ تبدیل کرتی چلی جا رہی تھی اور بختاور گیلی مٹی اٹھا اٹھا کر بخشو کے سامنے ڈھیر کرتی جا رہی تھی۔ لیکن اس کی پوری توجہ نصرت فتح علی خان کی آواز پر لگی ہوئی

تھی جو پاس ہی رکھے اسٹول پر پڑے ریڈیو میں سے بلند ہو رہی تھی۔

میری عید والا چن کدوں چڑھے گا
اللہ جانے ماہی کدوں ویڑھے وڑے گا
دکھ ڈاھڈے نے تے جندڑی ملوک
ماہیا مینوں یاد آنودا
سن چرخے دی مٹھی کوک

(میری عید کا چاند کب چڑھے گا
اللہ جانے ماہی کب گھر آئے گا
دکھ بہت ظالم اور جان کمزور ہے
مجھے ماہی یاد آتا ہے
چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر)

''بختاورے......! کدھر گم ہوگئی......؟ مٹی رکھ نا......!'' بخشو کی آواز پر بختاور نے چونک کر باپ کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی مٹی کا تسلہ بخشو کے پاس پلٹ دیا۔ تصور کے پردوں پر گزری رات کے مناظر، صارم کا مسکراتا چہرہ، اور کان ریڈیو سے ابھرنے والی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

ماہی آوے گا تے خوشیاں مناواں گی
اوہدے راہوں وچ اکھیاں وچھاواں گی
جان چھڈی اے وچھوڑیاں نے پھوک
ماہیا مینوں یاد آنودا
سن چرخے دی مٹھی کوک

(ماہی آئے گا تو خوشیاں مناؤں گی
اس کے راستے میں آنکھیں بچھاؤں گی
جان کو تو جدائیوں نے راکھ کر ڈالا ہے

مجھے ماہی یاد آتا ہے

چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر)

بختاور نے مٹی کا ایک اور تسلہ بھرا اور لے جا کر بخشو کے سامنے پلٹ دیا۔ بخشو کے ہاتھ انتہائی چابک دستی سے چاک پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے تھے اور وہ پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف تھا اس نے ایک نظر بختاور کی طرف دیکھا جو مٹی سے لتھڑے ہاتھ اپنی ٹھوڑی پر ٹکائے دور کہیں خلاؤں میں تک رہی تھی اور فضا میں آواز بلند ہو رہی تھی۔

طعنے مار دے نے اپنے شریک وے

لکھ چٹھی وچ اون دی تاریک وے

کالی رات والی ڈنگے مینوں شوک

ماہیا مینوں یاد آنودا

سن چرخے دی مٹھی کوک

(شریک طعنے دیتے ہیں

اپنے آنے کی تاریخ چٹھی میں لکھ بھیجو

اب تو کالی رات بھی ڈنک مار رہی ہے

مجھے ماہی یاد آتا ہے

چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر)

"بختاورے......! کہاں دھیان ہے تیرا......؟ کب سے آوازیں دے رہا ہوں مگر تو سنتی ہی نہیں۔ کام کی طرف تو دھیان ہی نہیں ہے تیرا......! سارا سارا دن خلاؤں میں نہ جانے کیا دیکھتی رہتی ہے......؟ طبیعت تو ٹھیک ہے نہ تیری......؟ دماغ کو بخار تو نہیں چڑھ گیا......؟ اگر ایسی کوئی بات ہے تو حکیم جی سے دوائی لے آ......! چل جا......! میں خود کام کر لوں گا...... تو جا کر آرام کر۔"

"نن......نہیں بابا......! ایسی تو کوئی بات نہیں...... لا رہی ہوں نا میں مٹی۔"

بختاور نے گڑبڑا کر کہا اور جلدی سے تسلے میں مٹی بھرنے لگی۔

کتاں پونیاں تے ہنجو میرے وگدے
ہن ہاسے وی نئیں مینوں چنگے لگ دے
کیویں بھل جاواں اوہدے میں سلوک
ماہیا مینوں یاد آنودا
سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک

(چرخہ کاتتے ہوئے میرے آنسو بہتے ہیں
اب تو ہنسنا مسکرانا بھی اچھا نہیں لگتا
اس کی محبت اس کا سلوک کیسے بھول جاؤں
مجھے ماہی یاد آتا ہے
چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر)

سن چرخے دی مٹھی مٹھی کوک
ماہیا مینوں یاد آنودا
میرے دل وچوں اٹھ دی اے ہوک
ماہیا مینوں یاد آنودا

(چرخہ چلنے کی میٹھی میٹھی آواز سن کر
مجھے ماہی یاد آتا ہے
تو میرے دل سے ایک ہوک سی اٹھتی ہے
مجھے ماہی یاد آتا ہے)

☆☆☆

بچاؤ......! بچاؤ......! کی آواز ہوا کے دوش پر تیرتی ہوئی جب شکیل کے کانوں سے ٹکرائی تو شکیل کے بڑھتے ہوئے قدم بے اختیار رک گئے۔ چھ فٹ قد کا مالک اونچا لمبا شکیل ایک مضبوط اور کسرتی جسم کا مالک تھا اور کیوں نہ

ہوتا......؟ شکیل کراٹے چمپئن تھا۔ بہت سے مقابلے جیت چکا تھا۔ آج تک پورے ملک میں کہیں بھی جوڈو کراٹے کے مقابلے ہوئے تھے تو شکیل ان مقابلوں میں شریک تھا اور جیت ہمیشہ اس کی جیب میں پڑی ہوتی تھی۔

دن رات کی پریکٹس سخت ورزشوں اور مشقوں کی مدد سے اس نے اپنے آپ کو ناقابل تسخیر بنا لیا تھا۔ اس کا بدن کسی پتھر کی طرح سخت اور ارادے چٹان کی طرح مضبوط تھے۔ اپنی انتھک محنت ہی کی بدولت اس نے آج تک ہر مقابلہ جیتا تھا۔ ہارنا تو جیسے اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

لیکن جہاں اس نے ہر جگہ جیت کے جھنڈے گاڑھے تھے وہیں وہ ایک احساس محرومی کا شکار بھی تھا لیکن وہ احساس، وہ محرومی، قدرت کا فیصلہ تھی اور ہر مقابلہ جیتنے کے باوجود وہ قدرت کے سامنے بے بس تھا۔ یہاں جیتنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

مضبوط سڈول اور خوب صورت جسم رکھنے کے باوجود شکل و صورت کے معاملے میں اس کے یکسر الٹ معاملہ تھا۔ گہری سیاہ رات جیسی تاریک رنگت، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹے موٹے ہونٹ، گھونگریالے بال اور پکوڑے جیسی ناک کے ساتھ وہ اس ملک کا باسی تو ہرگز لگتا ہی نہیں تھا بلکہ افریقہ کے کسی قبائلی علاقے کا باشندہ دکھائی دیتا تھا۔

اس کے باوجود اسے اپنے ملک سے گہری محبت تھی۔ اس کا دل ایک درد مند دل تھا۔ وہ اپنے ملک کی دن بدن بگڑتی ہوئی صورت حال اور حکمرانوں کی بے حسی پر ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا لیکن کروڑوں عوام کی طرح وہ بھی بے بس تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہاں جو بھی حکمران آتا ہے، وہ سوائے اپنی جیبیں بھرنے کے اور کچھ نہیں کرتا۔

ہر حکمران اس ملک کے ساتھ سوتیلی ماں کا سا سلوک کرنے پر مجبور ہے کہ ہم خود انہیں ایوانوں تک پہنچاتے ہیں۔ یہ اختیار یہ طاقت ہم عام لوگ ہی تو انہیں

بھیک میں دیتے ہیں۔ اپنی سخاوت، اپنی فیاضی کا اس قدر مظاہرہ کرتے ہیں کہ ووٹ دیتے وقت یہ تک نہیں سوچتے کہ کیا یہ لوگ اس کے اہل بھی ہیں یا نہیں......؟

بچاؤ......! بچاؤ......! کی فریادی آواز ایک مرتبہ پھر سنائی دی تو شکیل نے چوکنا انداز میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں لیکن کچھ نظر نہ آیا۔ ہاں......آواز کی سمت کا کسی حد تک اندازہ اسے ضرور ہوگیا تھا۔ آواز اس کے بائیں سمت کچھ فاصلے پر موجود ایک نیم تاریک گلی سے بلند ہو رہی تھی۔

کوئی لڑکی انتہائی خوفزدہ انداز میں چلائی تھی اور شکیل اب اس معاملے میں ٹانگ اڑائے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔ آواز میں خوف تھا، کرب تھا، بے چارگی تھی، التجا تھی اور صاف ظاہر تھا کہ لڑکی کسی مصیبت میں ہے اور دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا شکیل کی سرشت میں شامل ہی نہیں تھا کیونکہ وہ حکمران نہیں تھا، وہ ایک عام آدمی تھا۔ لیکن اب اتنا عام بھی نہیں تھا کہ کسی مجبور اور لاچار کی مدد نہ کرسکتا۔ سو اس کے قدم آپوں آپ ہی نیم تاریک گلی کی جانب اٹھتے چلے گئے۔

جونہی وہ گلی میں داخل ہوا بے اختیار لڑکھڑا کر رہ گیا۔ اس کے منہ پر پڑنے والا مُکا تو اتنا زوردار نہیں تھا کہ وہ لڑکھڑا جاتا۔ ہاں...... بے خیالی کی وجہ سے وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ پایا تھا اور لہرا کر رہ گیا تھا کیونکہ اسے اپنے اس محبت بھرے استقبال کی ہرگز بھی توقع نہ تھی۔ اس لئے وہ بے پرواہ سے انداز میں گلی کے اندر داخل ہوا تھا نتیجتاً ایک شاندار مُکا اسے اپنے جبڑے پر برداشت کرنا پڑا تھا۔

حملہ آور سنبھل کر ایک مرتبہ پھر جھپٹا لیکن اس مرتبہ اس کا مُکا شکیل کے چہرے پر صدقے واری ہونا ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ اب شکیل سنبھل چکا تھا اور اس کی ساری حسیات بیدار ہو چکی تھیں۔

حملہ آور کے جس مکے نے شکیل کا چہرہ چوما تھا وہی مُکا شکیل کی تمام تر حسیات کی بیداری کا باعث بن چکا تھا اور اب شکیل کو زیر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔

حملہ آور جو شاید شکیل سے پوری طرح واقف نہیں تھا اس کا داہنا ہاتھ شکیل کے ہاتھ میں آچکا تھا اور شکیل سے ناواقفیت اسے بہت مہنگی پڑی تھی۔ شکیل نے نہ صرف بائیں ہاتھ سے اس کا مُکا روکا تھا بلکہ اس کا ہاتھ بھی شکیل کی گرفت میں تھا۔ اس کے ساتھ ہی شکیل کا جچا تلا رائٹ ہک حملہ آور کی ناک پر پڑا اور اس کی ناک سے بھل بھل خون بہنے لگا۔ شاید اس کی ناک کا بانسہ چٹخ گیا تھا۔

حملہ آور بلبلا کر رہ گیا لیکن شکیل نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں موجود حملہ آور کے ہاتھ کو پوری قوت سے اپنی جانب کھینچا جس کے نتیجے میں شکیل اور حملہ آور کا فاصلہ انتہائی تیزی سے ختم ہوا اور وہ پوری قوت سے شکیل کی طرف گھسا لیکن اس وقت تک شکیل اپنا گھٹنا مناسب انداز میں موڑ چکا تھا۔ اس کے گھٹنے کی وہ زوردار ضرب حملہ آور کو اپنی ناف پر سہنا پڑی اور وہ ڈکراتا ہوا الٹ کر گرا۔

ٹھیک اسی لمحے شکیل کو انتہائی تیزی سے نیچے جھکنا پڑا۔ اگر اسے ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو لوہے کی وہ سلاخ اس کے سر کا کچومر بنا دیتی جو شکیل کو غافل جانتے ہوئے حملہ آور کے ایک اور ساتھی کی طرف سے شکیل سے اپنی بے پایاں محبت کا عملی مظاہرہ تھی۔ سلاخ کو اپنا مطلوبہ ہدف نہ ملا تو حملہ آور اپنی ہی جھونک میں آگے بڑھتا چلا گیا۔

شکیل تیزی سے کھڑا ہوتے ہوئے ایک ٹانگ پر گھوم گیا جبکہ اس کی دوسری ٹانگ ایک دائرے میں گھومتی ہوئی حملہ آور کے پہلو پر پڑی اور وہ تقریباً تین فٹ اونچا اچھل کر اڑتا ہوا دور جا گرا۔ ٹھیک اسی لمحے کڑکڑاہٹ کی خوفناک آواز بلند ہوئی جسے سن کر شکیل کے بدن میں لہو کی گردش تیز ہوگئی تھی۔ وہ اس آواز کو پہچان چکا تھا۔ اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو سامنے ہی ایک انتہائی خوب صورت لڑکی نظر آئی جسے ایک شخص نے بری طرح دبوچ رکھا تھا جبکہ دوسرا شخص کراری دار چاقو کھولنے کے بعد تیز رفتاری کے ساتھ اسے ایک ہاتھ سے دوسرے

ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے قدم قدم شکیل کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اس کی شکاری نظریں شکیل پر جمی ہوئی تھیں۔ چاقو کھلنے کی مخصوص آواز شکیل پہلے ہی شناخت کر چکا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوگئی کیونکہ ایسے کھیل تماشے اس کے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ حملہ آور کا انداز یہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھا کہ وہ ایک ماہر چاقو زن ہے۔ شکیل تیزی سے گردش کرتے ہوئے چاقو پر نظریں جمائے اپنی جگہ ساکت کھڑا تھا۔

جیسے جیسے چاقو ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل ہو رہا تھا، ویسے ویسے شکیل کی نظریں ادھر سے ادھر گردش کر رہی تھیں۔ اور پھر جوں ہی چاقو زن اس کے مطلوبہ فاصلے تک پہنچا شکیل کی ٹانگ انتہائی تیز رفتاری سے حرکت میں آئی۔

اوغ...... کی تیز آواز کے ساتھ حملہ آور اپنا ہاتھ پکڑ کر دوہرا ہوگیا۔ چاقو اس کے ہاتھ سے نکل کر اڑتا ہوا کہیں دور جا گرا تھا۔ کسی ماہر ایتھلیٹ کی طرح بھاگتے ہوئے شکیل نے ایک زوردار ٹکر حملہ آور کے سینے پر رسید کی اور وہ چاروں شانے چت زمین بوس ہوگیا۔ پھر شکیل نپے تلے انداز میں اس شخص کی طرف بڑھا جو لڑکی کو قابو کئے کھڑا تھا۔

اس شخص نے شکیل کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا تو لڑکی کو ایک زوردار دھکا دیا۔ لڑکی منہ کے بل زمین پر گری تو اس کے منہ سے ایک بے ساختہ چیخ بلند ہوئی، اس کی ٹھوڑی زمین سے ٹکرا گئی تھی۔ لڑکی نے جلدی سے سنبھلنے کی کوشش کی تو شکیل نے ایک لمحے کے لئے لڑکی کی طرف دیکھا۔ لڑکی کی ٹھوڑی سے خون رس رہا تھا۔

دوسرے ہی لمحے شکیل غیض و غضب کے عالم میں حملہ آور کی طرف بڑھا۔ حملہ آور نے بلا کی پھرتی سے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ریوالور نکال لیا لیکن اس کو چلانے کی حسرت اس کے دل میں ہی رہ گئی کیونکہ شکیل لانگ جمپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے جیسے اڑتا ہوا سا حملہ آور پر جا پڑا تھا۔ ریوالور حملہ آور کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ دونوں ایک ساتھ زمین پر آ رہے۔

شکیل نے اس کے چہرے پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ چند ہی لمحوں میں اس کے چہرے پر اچھے خاصے بیل بوٹے نمودار ہو گئے لیکن پھر اس کا داؤ چل گیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی زوردار ضرب شکیل کی کنپٹی پر پڑی تھی۔ شکیل کی آنکھوں میں نیلے پیلے ستارے سے ناچ اٹھے اور وہ لڑھک کر ایک طرف جا گرا لیکن اس نے سنبھلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ سر جھٹکتے ہوئے جونہی وہ کھڑا ہوا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اس سے بھڑنے والا شخص بھاگتا ہوا گلی کے موڑ پر غائب ہو رہا تھا۔

شکیل نے کھڑے ہو کر چاروں طرف نظریں دوڑائیں تو اس کے باقی ساتھی بھی کہیں نظر نہ آئے۔ وہ شاید پہلے ہی نو دو گیارہ ہو چکے تھے۔ میدان صاف دیکھ کر شکیل لڑکی کی طرف متوجہ ہوا جو سہمی ہوئی سی دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی اور اب خوفزدہ نظروں سے شکیل کی طرف دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

حیرت انگیز طور پر آج شام ہی سے مطلع ابر آلود تھا۔ آسمان پر ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہلکے بادل جیسے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ سنسناتی ہواؤں کے گیت ماحول میں پر ایک سحر طاری کر رہے تھے۔ بادلوں کی اوٹ سے کبھی کبھی نمودار ہوتا مسکراتا ہوا چاند آنکھوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ تھل اپنی روایتی خوب صورتی کے ساتھ حسب معمول گہری چپ کی چادر اوڑھے ہوئے تھا جیسے بزبان خموشی کہہ رہا ہو۔

تو بھی اپنی خواہشوں پر چپ کی چادر اوڑھ لے
میں بھی اپنے پیار کا قصہ سنا سکتا نہیں

ایسے عالم میں صارم اور بختاور آپس میں مدغم ہوتے ہوئے ان دو ٹیلوں کی آغوش میں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے خاموش بیٹھے تھے۔ وقت جیسے تھم چکا تھا اور چاروں طرف بہتی اس گہری خاموشی میں صرف آنکھیں بول رہی

تھیں اور یہ گفتگو ان دونوں کو بہت بھلی لگ رہی تھی۔ کبھی کبھی خاموشی کی زبان میں کی گئی باتیں گھنٹوں تقریر کرنے سے زیادہ اثر انگیز ہوتی ہیں اور یہ بات ان دونوں سے زیادہ اور کون جانتا تھا۔

''بختاور......! میں اس گاؤں میں صرف دس دن کے لئے آیا تھا لیکن آج مجھے یہاں آئے ہوئے پورے چالیس دن ہوگئے ہیں۔ تمہارے بغیر میرا یہاں سے جانا تو کیا سانس لینا بھی ناممکن ہو کر رہ گیا ہے۔ کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی کہ ہم دونوں ہمیشہ کے لئے ایک ہو جائیں......؟'' صارم نے سوالیہ نظروں سے بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو بختاور جیسے گہری نیند سے بے دار ہوئی اور پھر نظریں جھکاتے ہوئے بولی۔

''میرے بابا سے بات کرنا......!''

''دیکھو بختاور......! ہم دونوں دو الگ الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔ ہمارے درمیان فاصلہ بھی بالکل اسی طرح ہے جس طرح زمین اور آسمان...... میں شہر کا رہنے والا اور تم گاؤں کی باسی۔ میرے خاندان اور تمہارے گھر والوں کے رہن سہن میں بہت فرق ہے۔ تمہارے بابا تو شاید مان جائیں مگر میری فیملی اس رشتے کے لئے کبھی راضی نہیں ہوگی۔

ہاں...... یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر ہمارے ایک ہو جانے کے بعد ان کو پتا چلے تو رفتہ رفتہ شاید وہ ہمارے اس رشتے کی حقیقت کو تسلیم کر ہی لیں۔'' صارم کی بات سن کر بختاور پریشان ہوگئی اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''تو پھر کیا ہوگا......؟ کیا ہم نہیں مل پائیں گے......؟''

''میں نے یہ کب کہا......؟ تمہارے لئے اپنا خاندان تو کیا میں دنیا تک چھوڑنے کے لئے تیار ہوں۔ بس تمہارا ساتھ ہونا چاہئے۔'' صارم نے جذباتی انداز میں کہا۔

''اللہ نہ کرے صارم......! کہ آپ کو کچھ ہو...... اللہ آپ کو زندگی دے۔

آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ اور ہاں......! کیا آپ کو میری محبت پر شک ہے......؟ اگر آپ میرے لئے اپنا خاندان چھوڑ سکتے یں تو کیا میں اتنی کمزور ہوں کہ آپ کے لئے کچھ نہ کرسکوں......؟ آپ بابا سے بات تو کر کے دیکھیں، مجھے پورا یقین ہے کہ وہ مان جائیں گے۔'' بختاور نے جیسے صارم کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن میں نے بتایا نا کہ میرے گھر والے کبھی نہیں مانیں گے۔'' صارم نے دوٹوک انداز میں کہا اس کے لہجے میں قطعیت تھی۔

''آپ ایک بار کوشش تو کریں۔ کیا خبر وہ مان جائیں......؟'' بختاور نے امید وبیم کی کیفیت میں کہا۔ صارم نے ایک طویل سانس لی اور پھر گویا ہوا۔

''ٹھیک ہے...... تم کہتی ہو تو میں کوشش کرتا ہوں۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھو کہ اس کے لئے مجھے شہر جانا پڑے گا اور میرے اندازے کے مطابق اگر وہ نہیں مانے تو پھر شاید وہ مجھے اس گاؤں میں دوبارہ کبھی نہیں آنے دیں گے۔''

''آخر کوئی تو حل ہوگا......؟ کسی صورت تو انہیں منایا جا سکتا ہوگا......؟ اور آپ کے کہنے کے مطابق اگر وہ نہیں مانے تو پھر ہمارا کیا ہوگا......؟ کیا آپ میرے بغیر رہ سکیں گے......؟'' بختاور پریشان ہو کر بولی۔ جواب میں صارم نے جو کچھ کہا اسے سن کر بختاور دھک سے رہ گئی۔ دوڑتے بھاگتے ہوئے بادل جیسے اپنی جگہ ساکت ہوگئے۔ ہواؤں کے گیت ان کے گلے میں ہی گھٹ کر رہ گئے اور چاند بادلوں کی اوٹ سے منہ نکالے حیران نظروں سے ان دونوں کو تکتا رہ گیا۔

☆☆☆

بخشو حسب معمول اپنے کام میں جتا ہوا تھا۔ چاک تیزی سے گھوم رہا تھا اور اسی رفتار سے بخشو کے ہاتھ اور انگلیاں گیلی مٹی پر حرکت کرتی جا رہی تھیں اور گونگی مٹی کو زبان مل رہی تھی۔ بے نقش مٹی نئے سے نئی شکل میں ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔

بختاور بھی ہمیشہ کی طرح اپنے فرائض خوش اسلوبی سے ادا کر رہی تھی اور

بخشو کے سامنے گیلی مٹی کا ذخیرہ جمع ہوتا چلا جا رہا تھا کہ اتنے میں بیرونی دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی۔

''ٹھک ٹھک ٹھک......!''

''بختاورے......! ذرا دیکھ تو باہر کون ہے......؟'' بخشو نے مٹی کو چاک پر رکھتے ہوئے کہا۔

''کیا خبر...... کون ہو بابا......! تم خود دیکھو نا......؟'' بختاور نے کہا اور بھاگ کر اندرونی کمرے میں داخل ہوگئی۔

بخشو نے چند لمحوں تک حیرت زدہ انداز میں اس کی اس حرکت پر غور کیا پھر ایک طویل سانس لیتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔

''السلام علیکم چاچا جی......!'' دروازہ کھلتے ہی خوش شکل صارم کا چہرہ نظر آیا۔

''وعلیکم السلام پتر......! خیریت تو ہے......؟'' بخشو نے تعجب بھری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''چاچا......! آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ اگر آپ تھوڑا وقت دے سکیں تو......؟''

''بسم اللہ......! پتر......! اندر آجا......! ہم غریبوں سے کیا کام پڑا گیا شہری بابو کو......؟'' بخشو واپس مڑتے اور صارم کو اندر آنے کا کہتے ہوئے بولا۔ لہجہ بدستور سوالیہ تھا۔

پھر کچھ ہی دیر کے بعد بخشو چاک کے عقب میں اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھا تھا اور سوالیہ نظروں سے صارم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ جبکہ صارم ایک اسٹول پر بیٹھا پرسوچ انداز میں سر کھجاتے ہوئے شاید مناسب الفاظ اور حوصلہ مجتمع کر رہا تھا۔ پھر شاید وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوگیا اور بولا۔

''برا مت ماننا چاچا......! میں جانتا ہوں کہ گاؤں، دیہات کے ماحول میں

ان باتوں کو بہت معیوب سمجھا جاتا ہے لیکن کچھ باتیں ایسی ہوتی جنہیں کئے بغیر کوئی چارہ بھی نہیں ہوتا اور یہ بات بھی کچھ ایسی ہی ہے جو ہر حال میں مجھے آپ سے کرنی ہی ہے۔''

صارم نے لحظہ بھر رک کر بخشو کے چہرے پر نظریں دوڑائیں لیکن اس کا چہرہ سپاٹ تھا اور وہ خاموشی سے صارم کی طرف دیکھ رہا تھا۔

صارم نے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں۔ بختاور اسے کہیں نظر نہ آئی لیکن وہ جانتا تھا کہ بختاور اس کی آمد سے باخبر بھی ہے اور اس وقت یہاں ہونے والی گفتگو بھی سن رہی ہے۔ چند لمحے توقف کے بعد صارم نے کھنکھار کر جیسے گلا صاف کیا اور پھر سلسلہ کلام کو جوڑتے ہوئے بولا۔

''چاچا جی......! بات دراصل یہ ہے کہ میں آپ کی بیٹی بختاور کو پسند کرتا ہوں اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ میں...... آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ میرے ساتھ ہمیشہ خوش رہے گی۔'' یہ بات کہہ کر صارم کے سر سے جیسے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

بخشو کے انداز میں کوئی تبدیلی نمودار نہیں ہوئی۔ وہ بدستور خالی خالی نظروں سے صارم کی صورت دیکھے جا رہا تھا۔ لیکن جب وہ بولا تو اس کی باتیں کسی بھی طرح نظرانداز کی جانے والی نہیں تھیں۔

''دیکھو پتر جی......! میں بوڑھا آدمی ہوں، زمانے کا سرد و گرم دیکھے ہوئے ہوں۔ اس لئے تمہاری بات تسلی سے سن لی ہے میں نے۔ لیکن ضروری نہیں کہ اس کا جواب بھی تمہاری توقع کے مطابق ہو۔ ابھی پچھلے دنوں میں منڈی مویشیاں گیا تھا تو وہاں ایک بھینس مجھے بہت پسند آئی جسے غلام حسین سومرو نے خرید لیا اور گاؤں لے آیا۔ آتے جاتے اب بھی میں روز اسے دیکھتا ہوں اور وہ بھینس آج بھی مجھے اتنی ہی پسند ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں لا کر اسے اپنے کھونٹے پر باندھ لوں۔'' بخشو سیدھے سادھے دیہاتی انداز میں گفتگو کر رہا تھا لیکن

اس کی اس دیہاتی انداز کی گفتگو سے گہرا فلسفہ جھلک رہا تھا۔ اس کی عمر کا تجربہ جھانک رہا تھا۔ بخشو سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

"ہر پسند آجانے والی چیز کو ملکیت تو نہیں بنایا جا سکتا نا......؟ تم شہر میں رہنے والے ضرور ہو لیکن کچھ روایات ابھی تک شہروں میں بھی زندہ ہیں۔ تم زمیندار غلام حسین سومرو کے گھر رکے ہوئے ہو جس کا بیٹا تمہارا دوست ہے۔ جو شہر سے پڑھ کر تو ضرور آیا ہے لیکن اس کی حرکتوں اور عادات و اطوار سے میں ہی کیا، پورا گاؤں بلکہ اردگرد کے تمام گاؤں والے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اور تم اس کے دوست ہو۔

کچھ ہی دن پہلے شہر سے آئے ہو، کیا کرتے ہو......؟ کہاں رہتے ہو......؟ کون سے خاندان سے تعلق رکھتے ہو......؟ میں کچھ نہیں جانتا...... پھر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ تم ایک اچھے انسان ہو......؟ تمہارے شہر کا تو مجھے پتہ نہیں، لیکن ہمارے یہاں رشتے ناطے لڑکے خود جا کر طے نہیں کرتے بلکہ خاندان کے بڑے، بزرگ بات کرتے ہیں۔ اگر تمہاری جگہ تمہارے والدین آ کر یہ بات کرتے تو شاید میں کچھ سوچ بھی لیتا۔ لیکن تمہاری یہ بات، یہ حرکت دیکھتے ہوئے تو میں اس بارے میں اس فیصلے کے علاوہ تمہیں اور کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔"

صارم کو شاید ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ چند لمحوں تک بخشو کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھا اور سست قدمی سے چلتا ہوا بخشو کے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آج بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاند منہ چھپائے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوائیں اپنا شرشر انداز ترک کر کے انتہائی سستی سے، جیسے صرف اپنا فرض ادا کرنے کی غرض سے چل رہی تھیں۔ ماحول پر خنکی چھائی

ہوئی تھی اور چاند کے نہ نکلنے کی وجہ سے اردگرد کے تمام مناظر کو تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔

صارم آج بھی ٹیلوں کے سنگم پر بیٹھا بختاور کا منتظر تھا لیکن بختاور اب تک نہیں پہنچی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے آگے سرک رہا تھا اور صارم بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب بختاور اس کے سامنے آئے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ صارم اور بختاور تقریباً ایک ساتھ یا کچھ لمحوں کے فرق سے آگے پیچھے ہی یہاں پہنچ جاتے تھے لیکن آج کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی بختاور نہیں پہنچ پائی تھی۔

انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ صارم کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے لیکن انتظار تو بہرحال اسے کرنا ہی تھا۔

آخرکار اس کا انتظار رنگ لایا اور معمول سے تقریباً دو گھنٹے کی تاخیر کے بعد اندھیرے کی اوٹ سے بختاور کا نرم و نازک وجود نمودار ہوا تو صارم نے سکون کی سانس لی۔

''اتنی دیر کیوں کر دی......؟'' صارم نے بے قراری سے پوچھا۔

''بابا نے تمہارے جانے کے بعد مجھے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی تھی اور آج سوئے بھی بہت دیر سے۔ مجھے ان سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں......؟'' بختاور نے پریشان کن انداز میں جواب دیا تو صارم بولا۔

''سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات نہیں...... میں تو پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ اتنا آسان نہیں۔ اور اس کا حل کیا نکل سکتا ہے، وہ بھی میں نے تمہیں بتا دیا تھا۔ تمہاری ہی ضد سے مجبور ہو کر میں نے تمہارے بابا سے بات کی لیکن ان کا جواب میری توقع کے خلاف نہیں تھا۔ اور پھر یہ تو ایک طرف کی صورت حال ہے،

اس کی اس دیہاتی انداز کی گفتگو سے گہرا فلسفہ جھلک رہا تھا۔ اس کی عمر کا تجربہ جھانک رہا تھا۔ بخشو سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا۔

''ہر پسند آ جانے والی چیز کو ملکیت تو نہیں بنایا جا سکتا نا......؟ تم شہر میں رہنے والے ضرور ہو لیکن کچھ روایات ابھی تک شہروں میں بھی زندہ ہیں۔ تم زمیندار غلام حسین سومرو کے گھر رکے ہوئے ہو جس کا بیٹا تمہارا دوست ہے۔ جو شہر سے پڑھ کر تو ضرور آیا ہے لیکن اس کی حرکتوں اور عادات و اطوار سے میں ہی کیا، پورا گاؤں بلکہ اردگرد کے تمام گاؤں والے بھی اچھی طرح واقف ہیں، اور تم اس کے دوست ہو۔

کچھ ہی دن پہلے شہر سے آئے ہو، کیا کرتے ہو......؟ کہاں رہتے ہو......؟ کون سے خاندان سے تعلق رکھتے ہو......؟ میں کچھ نہیں جانتا...... پھر میں یہ کیسے یقین کر لوں کہ تم ایک اچھے انسان ہو......؟ تمہارے شہر کا تو مجھے پتہ نہیں، لیکن ہمارے یہاں رشتے ناطے لڑکے خود جا کر طے نہیں کرتے بلکہ خاندان کے بڑے، بزرگ بات کرتے ہیں۔ اگر تمہاری جگہ تمہارے والدین آ کر یہ بات کرتے تو شاید میں کچھ سوچ بھی لیتا۔ لیکن تمہاری یہ بات، یہ حرکت دیکھتے ہوئے تو میں اس بارے میں اس فیصلے کے علاوہ تمہیں اور کوئی جواب نہیں دے سکتا کہ مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ اب تم جا سکتے ہو۔''

صارم کو شاید ایسے جواب کی توقع نہ تھی۔ وہ چند لمحوں تک بخشو کے چہرے کو دیکھتا رہا پھر ایک گہری سانس لیتے ہوئے اٹھا اور سست قدمی سے چلتا ہوا بخشو کے گھر سے باہر نکل گیا۔

☆☆☆

آج بھی آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ چاند منہ چھپائے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہوائیں اپنا شرشر انداز ترک کر کے انتہائی سستی سے، جیسے صرف اپنا فرض ادا کرنے کی غرض سے چل رہی تھیں۔ ماحول پر خنکی چھائی

ہوئی تھی اور چاند کے نہ نکلنے کی وجہ سے اردگرد کے تمام مناظر کو تاریکی نے ڈھانپ رکھا تھا۔

صارم آج بھی ٹیلوں کے سنگم پر بیٹھا بختاور کا منتظر تھا لیکن بختاور اب تک نہیں پہنچی تھی۔

وقت دھیرے دھیرے آگے سرک رہا تھا اور صارم بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اس گھڑی کا انتظار کر رہا تھا جب بختاور اس کے سامنے آئے اور وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ عموماً ایسا ہوتا تھا کہ صارم اور بختاور تقریباً ایک ساتھ یا کچھ لمحوں کے فرق سے آگے پیچھے ہی یہاں پہنچ جاتے تھے لیکن آج کافی دیر گزر جانے کے بعد بھی بختاور نہیں پہنچ پائی تھی۔

انتظار طویل ہوتا جا رہا تھا۔ صارم کے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے لیکن انتظار تو بہر حال اسے کرنا ہی تھا۔

آخر کار اس کا انتظار رنگ لایا اور معمول سے تقریباً دو گھنٹے کی تاخیر کے بعد اندھیرے کی اوٹ سے بختاور کا نرم و نازک وجود نمودار ہوا تو صارم نے سکون کی سانس لی۔

''اتنی دیر کیوں کر دی......؟'' صارم نے بے قراری سے پوچھا۔

''بابا نے تمہارے جانے کے بعد مجھے بہت ڈانٹ ڈپٹ کی تھی اور آج سوئے بھی بہت دیر سے۔ مجھے ان سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کیا کروں......؟'' بختاور نے پریشان کن انداز میں جواب دیا تو صارم بولا۔

''سمجھ میں نہ آنے والی تو کوئی بات نہیں...... میں تو پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ یہ اتنا آسان نہیں۔ اور اس کا حل کیا نکل سکتا ہے، وہ بھی میں نے تمہیں بتا یا تھا۔ تمہاری ہی ضد سے مجبور ہو کر میں نے تمہارے بابا سے بات کی لیکن ان کا جواب میری توقع کے خلاف نہیں تھا۔ اور پھر نہ تو ایک طرف کی صورت حال ہے،

میرا خاندان تو اس سے بھی زیادہ سخت رویہ اپنائے گا۔
میری نظر میں صرف اور صرف ایک وہی حل ہے جس سے ہمارا ملنا ممکن ہو سکتا ہے۔ جو میں تمہیں بتا چکا ہوں اس کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔''

''تو اگر تمہارے کہنے کے مطابق ہم خود سے شادی کر لیں تو...... تو میرے بابا کا کیا ہوگا......؟ کیا گاؤں میں ان کی عزت ختم ہو کر نہیں رہ جائے گی......؟ اور اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ بعد میں تمہارے گھر والے ہمارے اس رشتے کو تسلیم کر لیں گے۔'' بختاور نے آزردگی سے کہا۔

''دیکھو بختاور......! وقت بذات خود ہر زخم کا مرہم ہوتا ہے۔ اور جب ایک رشتہ قائم کر ہی لیا جائے گا تو پھر سوائے اس رشتے کو تسلیم کرنے کے نہ تو میرے گھر والوں کے پاس کوئی دوسرا راستہ ہوگا اور نہ ہی تمہارے بابا کے پاس۔
جب ہم ایک ہو جائیں گے تو پھر انہیں اس رشتہ کو ماننا ہی پڑے گا۔ میری نیت صاف ہے، ہم کوئی گناہ تو نہیں کر رہے نا......؟ میں باقاعدہ تم سے نکاح کر رہا ہوں اور تم میری بیوی بن کر رہو گی۔ اگر تم کہو گی تو کچھ عرصے کے بعد ہم دونوں تمہارے بابا سے ملنے آئیں گے۔ تب وہ ضرور مان جائیں گے۔ والدین زیادہ دیر اپنی اولاد سے ناراض رہ ہی نہیں سکتے۔''

صارم نے سمجھانے والے انداز میں بختاور سے کہا۔ بختاور ایک عجیب دوراہے پر آن کھڑی ہوئی تھی۔ وہ کشمکش کے عالم میں صارم کی طرف دیکھتی رہ گئی۔

ایک طرف اس کا محبت کرنے والا بابا تھا جس نے بچپن سے لے کر اب تک بساط بھر اس کی ہر خواہش پوری کی تھی تو دوسری طرف وہ جادوگر تھا جس کی دھڑکنوں پر حکومت تھی۔ یہ فیصلہ اس طرح ایک لمحے میں کر لینا بختاور کے بس کی بات نہیں تھی۔ ادھر صارم سوالیہ انداز میں اس سے مخاطب تھا۔

''بولو بختاور......! جواب دو......! کیا تم میرا ساتھ دو گی......؟ یا ہماری محبت کے انجام پر جدائی لکھ دیا جائے گا......؟ بولو......! جواب دو......!''

''ص......ص......صارم......! اتنا بڑا فیصلہ اتنی جلدی کیسے کر لوں......؟ اپنا گاؤں، اپنی سکھیاں اور سب سے بڑھ کر اپنے بابا کو چھوڑ کر......تمہارے ساتھ ایک ان دیکھی دنیا بسانے کیسے چلی جاؤں......؟ تم نے مجھے سخت امتحان میں ڈال دیا ہے۔ کیا کروں......؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' بختاور نے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔

''بس......تو پھر تمہیں تمہارا گاؤں، تمہاری سکھیاں اور تمہارے بابا کی محبت مبارک ہو...... میں واپس شہر جا رہا ہوں۔ اگر یہ ہی تمہاری محبت ہے تو اسے ایک داغ کی صورت اپنے دل پر سجائے ساتھ لے جاؤں گا۔ اگر تمہیں میری ضرورت ہے تو کل رات اسی وقت فیصلے کے ساتھ یہاں آنا ورنہ اگلے دن کے بعد تم دوبارہ کبھی میری شکل نہیں دیکھ پاؤ گی۔'' صارم نے غصیلے انداز میں کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے گاؤں کی سمت روانہ ہوگیا جبکہ بختاور وہیں کھڑی اپنی اشک بار آنکھوں سے صارم کو دور ہوتے دیکھتی رہ گئی۔

☆☆☆

اگلی رات بدستور ایک تاریک رات تھی۔ گہرے بادل چاند کی کرنوں کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ سر سے پاؤں تک ایک چادر میں لپٹا وجود جس کے ایک ہاتھ میں چھوٹا سا بیگ تھا، ریت کے ٹیلوں کی جانب محوِ سفر تھا۔

ٹیلوں کے قریب پہنچ کر اس نے بیگ ایک جگہ آڑ میں رکھا اور پھر ٹیلوں کے اردگرد گھوم کر دور تک نظریں دوڑائیں لیکن وہاں اور کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔ اس نے چہرے سے چادر ہٹائی اور پھر نیچے بیٹھ کر ٹیلے کے ساتھ ٹیک لگا دی۔

وہ بختاور تھی۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ کچھ ہی دیر کے بعد ایک جانب سے صارم نمودار ہوا اور اس کے قریب آ کر دھپ سے زمین پر بیٹھ گیا۔

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے درست فیصلہ کیا۔ ہمارے پاس اس کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ تم میرے ساتھ ہمیشہ خوش رہو گی۔'' صارم نے پُر جوش انداز میں کہا تو بختاور اپنی ڈبڈبائی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور غم ہی غم لہریں لیتا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر وہ دو آنسو ٹپک ہی پڑے۔

صارم نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے ایک انگلی کی مدد سے اس کے دونوں آنسو پونچھ ڈالے اور اس کا سر اپنے سینے سے لگاتے ہوئے بولا۔

''پگلی......! لڑکیاں ایک نہ ایک دن تو اپنے بابل کا گھر چھوڑ ہی دیتی ہیں۔ تھوڑا سا طریقے کا فرق ضرور ہے لیکن جا تو تم بھی پیا گھر ہی رہی ہو۔ حوصلے سے کام لو۔ اگر فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اب میرے ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلو۔ خوشیوں کا ایک نیا جہاں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔''

جواباً دور کہیں کسی کتے نے غرا کر جیسے صارم کی اس بات کا برا منایا لیکن وہ دونوں اس بات سے بے پرواہ ہو چکے تھے کہ ان کا یہ اقدام کسے اچھا لگتا ہے، اور کسے برا۔

وہ فیصلہ کر چکے تھے اور اب ہر حال میں اس پر عمل کرنا چاہتے تھے۔ بختاور نے آخری مرتبہ الوداعی انداز میں ریت کے ٹیلوں کو دیکھا۔ دور تک لہریں لیتے ہوئے تھل پر نظریں دوڑائیں۔

تھل...... جس کے سینے میں سینکڑوں راز دفن تھے۔ آج ایک نئی کہانی نئے راز سے آشنا ہو رہا تھا اور اس راز کو بھی راز ہی رکھنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔

بختاور نے نگاہوں ہی نگاہوں میں جیسے اپنے گاؤں کی بلائیں لیں، دل ہی دل میں اپنے بوڑھے بابا سے معافی مانگی اور پھر اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھا کر صارم کے

ساتھ گاؤں سے باہر جانے والے راستے پر گامزن ہوگئی۔ ہوا کے دوش پر لہریں لیتے ہوئے کہیں دور سے آئی ہوئی ایک گیت کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

نی میں جاناں جوگی دے نال
کنیں مندراں پا کے
نی میں جانا جوگی دے نال
(اپنے جوگی کے ساتھ جاؤں گی
میں اپنے کانوں میں بالیاں ڈال کر
اپنے جوگی کے ساتھ جاؤں گی)

بختاور بھی اپنے جوگی کے ساتھ چل نکلی تھی۔ گاؤں سے تھوڑی دور آنے کے بعد دونوں کے قدموں کی رفتار خودبخود تیز ہوگئی اور وہ لمحہ بہ لمحہ گاؤں سے دور ہوتے چلے گئے۔

تاریک رات، ویران صحرا اور دو ہیولے، جو کچھ ہی دیر کے بعد تاریکی کا حصہ بن کر رہ گئے۔

☆☆☆

سانولی رنگت کا مالک، بڑی بڑی مونچھوں والا یہ شخص جو صوفے پر نیم دراز تھا، تغلق خان تھا۔

تغلق خان کہاں سے آیا تھا؟ کس شہر کا باسی تھا؟ کوئی نہیں جانتا تھا۔ لیکن یہ سب جانتے تھے کہ جرائم کی دُنیا میں اس نے تیزی سے اپنا نام اور مقام بنا لیا تھا۔ چوری جیسے معمولی جرم سے لے کر اغواء، ڈکیتی، قتل، اسمگلنگ، منشیات کا کاروبار، اسلحے کی خرید وفروخت اور بردہ فروشی جیسے مکروہ جرائم اس کی چھتر چھایا تلے نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے تھے۔

بڑے بڑے سرکاری آفیسر، سیاست دان، وڈیرے اور وزیر مشیر اکثر اس کی خدمات حاصل کر کے اپنے ایسے مسائل حل کرواتے تھے جن کا حل انہیں اور

کہیں نہیں ملتا تھا۔ یوں دن بدن تغلق خان کے اثر و رسوخ میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا اور اس کی جڑیں گہری سے گہری ہوتی چلی جا رہی تھیں۔

تغلق فطرتاً ایک سفاک شخص تھا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ لومڑی کی طرح عیار اور چالاک بھی۔ اس نے اپنے آپ کو اس خوب صورتی سے کیمو فلاج کیا تھا کہ اس کے رہن سہن اور اس کی سرگرمیوں کو دیکھتے ہوئے کوئی آدمی آسانی سے اس کی شخصیت کے اس گھناؤنے روپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔

بظاہر وہ ایک مالدار سیٹھ تھا جو بڑھ چڑھ کر فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیتا تھا۔ کبھی کسی یتیم خانے کو چندہ دے رہا ہوتا تو کبھی دارالامان میں خواتین کی اشک شوئی کرتا نظر آتا۔ بہت سے فلاحی ادارے مستقل اس سے بڑی بڑی رقوم حاصل کر رہے تھے اور یوں تغلق خان اپنی دوہری شخصیت کو برقرار رکھے ہوئے تھا۔

جہاں تغلق خان کی ساری خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں وہیں یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ تغلق خان ایک خطرناک فائٹر بھی تھا۔ اس کا ذاتی خیال یہی تھا کہ دو بدو لڑائی میں اسے ہرانے والا کم از کم اس ملک کی زمین پر کوئی شخص موجود نہیں ہے۔ لیکن اس کا یہ خیال اس وقت غلط ثابت ہوگیا جب ماضی میں ایک مرتبہ وہ چند لڑکیوں کو ایک عرب شیخ کے پاس پہنچانے جا رہا تھا۔

بدقسمتی سے ایک لڑکی نے چیخ و پکار شروع کر دی تو ایک موٹر سائیکل سوار اس کی گاڑی کا پیچھا کرنے لگا۔ تغلق نے اسپیڈ بڑھا دی لیکن بے سود۔

موٹر سائیکل سوار اس کے پیچھے کسی جونک کی طرح چمٹ کر رہ گیا تھا۔ راستے میں ایک ویران سڑک پر پہنچتے تغلق نے گاڑی ایک سائیڈ پر کر کے روک دی اور دروازہ کھولتا ہوا نیچے اتر آیا۔ موٹر سائیکل سوار نے قریب پہنچ کر اسے للکارا تو تغلق کے ہونٹوں پر زہر خند مسکراہٹ دوڑ گئی۔ وہ اپنی فائٹنگ پاور سے بخوبی واقف تھا اور جانتا تھا کہ اکلوتے موٹر سائیکل سوار کو تو وہ چٹکیوں میں مسل کر رکھ دے گا لیکن اس کا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا تھا۔ کالے کلوٹے لیکن مضبوط جسم

والے اس نوجوان نے تغلق کو ناکوں چنے چبوا دیئے اور اسے دھنک کر رکھ دیا تھا۔

جب تغلق کا جوڑ جوڑ احتجاج کرنے لگا تو اس نے گھبرا کر چاقو نکال لیا لیکن افسوس کہ وہ چاقو پر ایک منٹ سے زیادہ گرفت قائم نہ رکھ سکا اور چاقو اس حبشی نما نوجوان کے ہاتھوں میں پہنچ گیا۔ تغلق نے کراہ کر ایک ہاتھ اپنے دائیں گال پر رکھ لیا۔ اس کے گال پر سجا لمبے اور گہرے زخم کا نشان اسی نوجوان کی دین تھا۔

آج بھی جب اسے یہ واقعہ یاد آتا تھا تو وہ ایک جھرجھری سی لے کر رہ جاتا تھا۔ اگر اس وقت تغلق کی قسمت یاوری نہ کرتی اور اس کے ہاتھ بے دھیانی یں وہ پتھر نہ آجاتا۔ جس نے اس شخص کو ہوش وخرد سے بے گانہ کر دیا تھا اور تغلق کو بچ نکلنے کا موقع مل گیا تھا تو شاید تغلق کی کہانی برسوں پہلے اسی دن ختم ہو چکی وتی۔

اسی ملک، اسی شہر میں اس کی ٹکر کا بلکہ اس پر حاوی آجانے والا ایک شخص وجود تھا لیکن تغلق کا سامنا دوبارہ اس شخص سے کبھی نہیں ہوا۔ جب جب تغلق کو ضی کا یہ تلخ واقعہ یاد آتا تھا اس کی مٹھیاں غصے سے بھینچ جاتی تھیں اور ایسا روز ہوتا ما اس وقت جب کوئی شخص بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تو لاشعوری طور پر ں کا ہاتھ اپنے گال پر بنے لمبے اور گہرے زخم کو سہلانے لگتا یا پھر اس وقت جب ہ آئینہ دیکھتا۔ لیکن وہ شخص دوبارہ کبھی اس کے سامنے نہیں آیا تھا۔

اس وقت بھی وہ ماضی کی اسی تلخ یاد میں گم تھا جب فون کی گھنٹی سنائی دی۔ ں نے چونک کر فون کی طرف دیکھا اور بدستور صوفے پر نیم دراز حالت میں ھ بڑھاتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔

”تغلق اسپیکنگ......!“

اور پھر دوسری طرف سے سنائی دینے والی آواز پر تغلق کی باچھیں کھل گئیں ر وہ اپنی ساری پریشانی اور غم و غصہ جیسے یکسر بھول گیا۔ وہ کتنی ہی ترقی کر لیتا، کتنا ا مالدار کیوں نہ ہو جاتا۔ بنیادی طور پر وہ ایک حریص اور لالچی انسان تھا اور

فطرت تبدیل نہیں ہوتی۔

''اوئے شہزادے......! کہاں گم ہو گئے تھے......؟ بہت عرصے کے بعد یا
کیا تغلق خان کو......؟''

کچھ دیر خاموش رہ کر اس نے دوسری طرف سے اپنی بات کا جواب سنا تو
اس کی پہلے سے کھلی ہوئی باچھیں پھیل کر کانوں تک پہنچ گئیں۔ یقیناً دوسری طرف
سے کوئی ایسی ہی بات کی گئی تھی جو اس کے لئے بہت زیادہ دلچسپی کی حامل تھی۔

''ہاں......تو پھر جلدی سے آجاؤ......! تمہاری صلاحیتوں کا تو پہلے ہی معتقد
ہوں، فنکار آدمی ہو یار......! ہاں ہاں وہیں......میں انتظار کر رہا ہوں۔'' اس نے
ریسیور کریڈل پر رکھا اور دھیمے سروں میں سیٹی بجانے لگا اس کا موڈ یک لخت ہی
خوشگوار ہو گیا تھا۔ پھر تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کے بعد دروازے پر دستک سنائی دی تو تغلق
پرُ جوش انداز میں بولا۔

''آؤ آؤ شہزادے......! تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں......؟'' دروازہ کھلا اور
ایک خوش شکل نوجوان کمرے میں داخل ہوا تب دونوں آپس میں بغل گیر ہو گئے۔
تقریباً آدھے گھنٹے تک دونوں میں زور وشور سے گفتگو ہوتی رہی۔ دونوں ہی بہت
خوش نظر آرہے تھے۔

پھر تغلق خان نے انٹرکام اٹھا کر چند لمحوں کے لئے کسی سے کچھ بات چیت
کی۔ کچھ ہی دیر کے بعد جینز اور جیکٹ میں ملبوس لمبے لمبے بازوؤں والا ایک ریچھ
نما انسان کمرے میں داخل ہوا جس کے ہاتھ میں ہزار ہزار کے نوٹوں کی دو گڈیاں
تھیں۔

''حشمت خان......! یہ صارم بابو کو دے دو...... اور جگی اور نورے کو ساتھ
لے کر اس کے گھر پہنچ جاؤ اور ''نگ'' اٹھا لاؤ۔'' حشمت نے ادب سے سر جھکایا
اور نوٹوں کی دونوں گڈیاں اس خوش شکل نوجوان کی طرف بڑھا دیں جسے تغلق نے
صارم کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ پھر کمرے میں حشمت کی کھرکھراتی ہوئی سی آواز بلند

ہوئی۔

"باس......! ابھی جانا ہے کیا......؟"

"ہاں......! ابھی چلے جاؤ......! اور سنو......! وریام کو بھی ساتھ لے جاؤ...... اور دیکھو "نگ" بڑا قیمتی ہے۔ احتیاط سے لانا۔" تغلق کی بات ختم ہونے پر ایک مرتبہ پھر حشمت کی وہی مخصوص کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی۔

"جو حکم باس......! ایسا ہی ہوگا۔" حشمت نے ایک مرتبہ پھر تغلق کو تعظیم دی اور پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد خوش شکل نوجوان صارم نے بھی اٹھ کر تغلق سے مصافحہ کیا اور وہ بھی روانہ ہوگیا۔ اب کمرے میں صوفے پر نیم دراز تغلق کے علاوہ اور کوئی نہ تھا، اس کے ہونٹوں پر ایک مکروہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔

☆☆☆

فرش پر بچھا ہوا قالین، ایک ٹی وی ٹرالی جس پر سجا ہوا ایک چھوٹا سا کلر ٹیلی وژن، ایک طرف چھوٹی سی ٹیبل پر سجا ہوا خوب صورت ڈیک، کھڑکیوں پر بھاری پردے اور ایک کونے میں بجی ہوئی دیوار گیر الماری اس چھوٹے سے کمرے کا کل اثاثہ تھا۔

اس وقت کمرے میں ایک حسین وجمیل لڑکی کے علاوہ اور کوئی ذی روح موجود نہ تھا۔

لڑکی نے بیڈ سے اتر کر چپل پہنی اور ایک ادا کے ساتھ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اکٹھا کر کے جوڑے کی شکل میں لپیٹ دیا۔ یہ بختاور تھی۔ جب سے صارم نے اسے اس مکان میں لاکر ٹھہرایا تھا اس کا اعتماد صارم پر مزید بڑھ گیا تھا کیونکہ مکمل تنہائی میسر ہونے کے باوجود صارم نے کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی تھی اور جب صارم نے بختاور سے یہ کہا تھا۔

"بختاور......! میں تمہیں یہاں لے تو آیا ہوں لیکن تب تک میں تمہارے

قریب نہیں آؤں گا جب تک میرا اور تمہارا نکاح نہیں ہو جاتا۔'' تو بختاور کا دل ا
کے یہ جملے سن کر ناچ اٹھا تھا۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ وہ صارم کا منہ چ
لے لیکن اب وہ اتنی بے باک بھی نہیں تھی کہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنا دیتی
گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی، بختاور نے پہلی مرتبہ اس گھر
کھانا پکایا جسے دونوں نے مل کر بڑے مزے سے کھایا۔ اس کے بعد صارم اس
یہ کہہ کر رخصت ہوا تھا کہ

''بختاور......! میں اب زیادہ دیر تمہاری دوری برداشت نہیں کر سکتا لیک
نکاح کے بغیر تمہاری قربت کو بھی گناہ سمجھتا ہوں۔ لہٰذا میں نکاح خوان اور ا
کچھ دوستوں کو لینے جا رہا ہوں تا کہ تم آج ہی میری زندگی میں شامل ہو جاؤ۔
تھوڑی دیر ہو جائے گی لیکن تم پریشان مت ہونا۔ اس گھر کو اور اس گھر کی ہر چ
اپنی ملکیت سمجھو۔ میں اب جاتا ہوں اور اب تمام انتظامات کر کے ہی واپس آ
گا۔''

یہ کہہ کر صارم اس سے رخصت ہو گیا تھا اور تقریباً دو گھنٹے گزر جانے
بعد بھی ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ لیکن بختاور کے دل میں کسی قسم کا کوئی وس
نہیں تھا، کسی پریشانی کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مطمئن انداز میں بیڈ پر لیٹی آرام ک
رہی تھی اور اس وقت بال لپیٹنے کے بعد اس کا رخ اس چھوٹی سی خوب صورت
کی طرف تھا جس پر ڈیک سجا ہوا تھا۔ اس نے ڈیک آن کیا تو کمرے میں ا
دلکش گیت گونجنے لگا۔

رفتہ رفتہ ایک نئی صورت بنا لیتے ہیں لوگ
ایک چہرے پہ کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ

ٹھیک اسی وقت کمرے کا دروازہ ایک دھماکے سے کھلا اور چار خطر
صورت آدمی ایک ساتھ کمرے میں داخل ہوئے۔ بختاور جو دھماکے کی آواز سنتے
اچھل پڑی تھی، گھبرا کر پلٹی تو ان خطرناک لوگوں کے چہرے پر نظر پڑتے ہی

اختیار اس کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی۔

''کک...... کک...... کون ہو تم......! کیوں گھس آئے ہو یہاں پر......؟''
اور کمرہ حشمت کے منحوس قہقہے سے گونج اٹھا۔ وہ چاروں ایک ساتھ بختاور کی طرف بڑھے تو بختاور بے اختیار پیچھے ہٹنے لگی۔

''د...... د...... دیکھو...... اگر صارم یہاں آ گئے تو تم میں سے کسی کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ یہاں سے چپ چاپ باہر نکل جاؤ......!'' بختاور نے خوفزدہ انداز میں پیچھے ہٹتے ہوئے انہیں دھمکانے کی کوشش کی۔ لیکن جواب میں سنائی دینے والا حشمت کا قہقہہ پہلے سے زیادہ بلند تھا۔

''بی بی......! کسی غلط فہمی میں نہ رہنا۔ صارم بابو تم جیسی کئی تتلیوں کو پہلے بھی یہاں لا چکے ہیں اور یہ بھی سن لو کہ تمہاری قیمت پورے ''دو لاکھ'' روپے میں اپنے ہاتھوں سے صارم کو دے کر آ رہا ہوں۔ اب تم باس تغلق کی ملکیت ہو اور اب اچھے بچوں کی طرح چپ چاپ باہر چلو ورنہ حشر خراب کر دوں گا۔''

بختاور کے دماغ میں دھماکے سے ہو رہے تھے اور اس بدمعاش کے منہ سے نکلنے والا ایک ایک لفظ کسی کھولتے ہوئے لاوے کی طرح اس کی رگ و پے میں سرائیت کرتا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ شخص ایسا کیوں کہہ رہا ہے......؟ صارم تو اس کے بغیر جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو اس سے محبت کرتا ہے۔

''جھوٹ بول رہے ہو تم......! میرا صارم ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔'' بختاور نے چیختے ہوئے جیسے خود کو یقین دلانے کی کوشش کی۔

''ایسا ہو چکا ہے اور یہ اس نے پہلی مرتبہ نہیں کیا۔ تم سے پہلے بھی کئی بے وقوف لڑکیاں اسی غلط فہمی کا شکار ہو چکی ہیں۔ وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔ وہ صرف ایک بزنس مین ہے۔ جو صرف سودا کرتا ہے۔ اور اب تم میرا دماغ خراب مت کرو اور شرافت سے باہر چلو......!'' حشمت نے غراتے ہوئے کہا۔

لیکن جب اس کی تقریر دلپذیر کے کوئی اثرات بختاور پر ظاہر نہیں ہوئے تو اس نے جھپٹ کر بختاور کے بال مٹھی میں جکڑ لئے اور پھر اسے گھسیٹتا ہوا باہر لے آیا۔ بختاور بری طرح مچل رہی تھی اور حشمت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس کو اس اچھل کود سے کس طرح روکے......؟

جب وہ گلی میں پہنچے تو بختاور زور زور سے ''بچاؤ بچاؤ'' کی آواز لگاتے ہوئے چیخنے لگی۔ یہ دیکھ کر حشمت کا ساتھی جگی حشمت کی مدد کرنے کے لئے آگے بڑھ آیا لیکن وہ نرم و نازک لڑکی اس وقت کسی جوالا مکھی کی طرح غضب ناک ہو رہی تھی۔ جب وہ کسی صورت پرسکون نہ ہوئی تو حشمت نے اس کے منہ پر ایک زوردار تھپڑ رسید کیا۔

جس کے نتیجے میں بختاور کے حلق سے پہلے سے بھی زیادہ زور دار چیخ بلند ہوئی اور وہ جنونی انداز میں چلانے لگی۔

''بچاؤ......! بچاؤ......!''

اس دوران حشمت کے دو ساتھی گلی کی نکڑ تک پہنچ چکے تھے۔ حشمت نے ایک ہاتھ سے بختاور کا منہ بند کرنے کی کوشش کی تو بختاور نے اس کے ہاتھ پر زور سے کاٹ لیا۔ حشمت نے الٹے ہاتھ سے بختاور کو ایک اور تھپڑ رسید کیا۔ ٹھیک اسی لمحے دھپ کی آواز سن کر ان تینوں کی نظریں ایک ساتھ اٹھیں۔ سامنے ایک عجیب و غریب منظر نظر آیا۔

ان کا ایک ساتھی زمین پر گرا بری طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اور دوسرا سلاخ اٹھائے ایک شخص پر حملہ آور ہوتا دکھائی دیا۔ لیکن کچھ ہی دیر بعد وہ بھی زمین چاٹ رہا تھا۔

حملہ آور جوں ہی ان کی طرف بڑھا جگی نے چاقو نکال لیا۔ لیکن بے سود پھر حشمت نے بختاور کو دھکا دے کر زمین پر گرا دیا اور ریوالور نکال لیا لیکن حشمت کا انجام بھی اپنے تینوں ساتھیوں سے مختلف نہ رہا۔ نو وارد نے ان چاروں کو دھنک

کر رکھ دیا تھا۔ اور پھر وہ چاروں سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

☆☆☆

تغلق اس وقت کسی زخمی شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا اور وہ چاروں کے چاروں سر جھکائے شرمندہ شرمندہ، اس کے سامنے کھڑے تھے۔

''مفت کی کھا کھا کر تم لوگوں پر چربی چڑھ گئی ہے۔ ایک ذرا سا کام نہیں کر سکے تم لوگ...... ؟ چار ہٹے کٹے مرد ایک نرم و نازک سی لڑکی کو یہاں تک نہیں لا سکے، تم لوگوں کو تو تمغہ امتیاز ملنا چاہئے۔''

تغلق دھاڑ رہا تھا۔ جواب میں حشمت کی وہی منحوس کھرکھراتی ہوئی آواز بلند ہوئی جو شرم سے بھیگ کر اس وقت ایک عجیب تاثر دے رہی تھی۔

''باس......! لڑکی کو تو ہم لے ہی آتے لیکن وہ حبشی نما انسان پتا نہیں اچانک کہاں سے آن پہنچا...... ؟ جس نے سارا نقشہ ہی بدل کے رکھ دیا۔ ہم چاروں کوشش کے باوجود اس کا مقابلہ نہیں کر سکے ہم شرمندہ ہیں باس......!'' حبشی نما انسان کا ذکر سنتے ہی تغلق کو جیسے کرنٹ سا لگا اور اس کا ہاتھ بے اختیار اپنا گال سہلانے لگا۔

''کیا کہا...... ؟ حبشی نما انسان...... ؟ ذرا اس کا پورا حلیہ بتاؤ......!'' تغلق نے چونکتے ہوئے کہا۔ اب اس کے لہجے میں وہ پہلے سی گھن گرج موجود نہیں تھی۔

جب حشمت نے اس کا پورا حلیہ بیان کیا تو تغلق کے حلق سے ایک طویل سانس خارج ہوئی اور اس کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔

اس کی نظروں کے سامنے ماضی کا وہی واقعہ کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔

''ٹھیک ہے......! اس کا مقابلہ تمہارے بس کی بات بھی نہیں تھی۔''

''تم لوگ جاؤ......!'' اور وہ چاروں ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکلتے چلے گئے۔ تغلق چند لمحوں تک پُرخیال انداز میں کھڑا رہا پھر ایک سائیڈ پر موجود بار کیبنٹ میں سے وہسکی کی بوتل نکال کر صوفے پر آ بیٹھا۔

شغل مے نوشی میں وقت کے گزرنے کا احساس جیسے ختم ہو کر رہ گیا تھا۔
پتہ نہیں کتنی ہی دیر تک وہ وہاں بیٹھا اپنا غم غلط کرتا رہا اور پھر اٹھ کر لڑکھڑاتے قدموں کے ساتھ عقبی سمت موجود ایک دروازہ کھول کر اندر داخل ہوگیا۔

یہ تغلق کی خواب گاہ تھی۔ وہ سیدھا اپنے بیڈ کی جانب بڑھا اور جوتوں سمیت بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ نیند کی آغوش میں کب پہنچا، اسے اس کا یکسر اندازہ نہ ہو سکا۔ پھر اس کی آنکھ چہرے پر لگنے والی اس زور دار ضرب ہی سے کھلی تھی۔ جوں ہی اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ جو چہرہ اس کی نظروں کے سامنے موجود تھا اسے اس کے یہاں پائے جانے کی توقع خواب میں بھی نہ تھی۔

گھونگریالے بال، سیاہ کالی رنگت، موٹے موٹے ہونٹ اور موٹی ناک والا یہ خطرناک شخص وہی تھا جسے کوشش کے باوجود تغلق آج تک دوبارہ نہیں دیکھ سکا تھا۔

آج وہی شخص اس کے گھر، اس کی خواب گاہ میں یوں موجود تھا کہ اس کا ایک گھٹنا تغلق کے سینے پر رکھا ہوا تھا اور اس کے ہاتھ میں موجود سائلنسر لگے خوفناک ریوالور کی نال تغلق کی پیشانی کی طرف اٹھی ہوئی تھی۔ تغلق کی سانس اس کے سینے میں اٹک رہی تھی اور نگاہیں ریوالور کے ٹرائیگر پر جمی ہوئی اس خوفناک شخص کی انگلیوں پر تھیں۔ تغلق نے کچھ بولنے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔

خوفناک شخص کی انگلی حرکت میں آئی۔

''کھٹک......!'' کی ہلکی سی آواز بلند ہوئی اور تغلق کے دماغ میں آگ کی ایک آبشار سی بہ نکلی۔ تکلیف اور کرب کی ایک شدید کیفیت کے ساتھ رنگ برنگی روشنیوں کا ایک بے ہنگم رقص تھا مگر صرف چند لمحوں کے لئے اس کے بعد تغلق کے دماغ پر اندھیرے چھا گئے۔

تغلق کی کہانی ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنی تمام تر خباثتوں کے ساتھ نیست و نابود ہو چکا تھا۔ اور برائی کا یہ انجام کوئی نیا نہ تھا؟ ایسے لوگ آخرکار اسی انجام کو پہنچتے ہیں۔

☆☆☆

سکڑی سمٹی بختاور نظریں جھکائے اس سیاہ پہاڑ کے سامنے بیٹھی تھی جو شاید سیاہی کا نہیں، عظمت کا پہاڑ تھا۔

''اگر یہ شخص اس وقت وہاں نہ پہنچتا تو......؟'' بختاور لرز کر رہ گئی۔ اس سے آگے سوچنے کی اس میں ہمت ہی نہ تھی۔

تھل...... اپنا گاؤں...... اپنی سکھیاں...... اور بابا...... بختاور کو سب یاد آ رہا تھا۔ اور صارم...... بختاور کے پورے وجود میں جیسے ایک آگ سی جل اٹھی۔ نفرت کی ایک لہر تھی جو اس کی پور پور کو جلائے دے رہی تھی۔ کتنا معصوم، کتنا خوش شکل لٹیرا تھا......؟ بالکل کسی خوشنما سانپ کی مانند۔

جس کا جسم تو خوب صورت نقش و نگار سے مزین ہوتا ہے لیکن اس خوب صورتی کے پیچھے چھپے زہر کا ایک قطرہ بھی انسان کو تڑپ تڑپ کر مرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔

اور دوسری طرف بظاہر بدصورت نظر آنے والا یہ شخص جس کا دل کتنا خوب صورت تھا......؟ کتنا تضاد تھا ان دو انسانوں میں......؟ اور سچ بھی تو ہے۔ بعض اوقات بظاہر خوشنما نظر آنے والی چیزیں اندر سے بہت بدنما ہوتی ہیں اتنی کہ ان کی اصلیت دیکھ کر گھن آنے لگے۔ اور کبھی کبھی بدصورت نظر آنے چیزیں درحقیقت اپنے اندر بے حد خوب صورتی لئے ہوئے ہوتی ہیں لیکن ان کو شناخت کرنے والی آنکھ ہر کسی کے پاس نہیں ہوتی۔

بختاور اپنے خیالات سے اس وقت چونکی جب عظمت کے اس پہاڑ میں جنبش پیدا ہوئی اور اس کے منہ سے نکلنے والی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

''میرا نام شکیل ہے۔'' اور پھر وہ تمسخرانہ انداز میں ہنس پڑا۔ جیسے خود اپنا مذاق اڑا رہا ہو۔

''کبھی کبھی والدین بھی معصومیت اور بے دھیانی میں کتنی بڑی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ اب مجھے ہی دیکھ لو...... کہیں سے شکیل نظر آتا ہوں......؟ چوہے سے ڈر جانے والا آدمی ہوتا ہے اور نام ہوتا ہے شیر خان......! خیر چھوڑو...... تم یہ بتاؤ کہ کہاں کی رہنے والی ہو......؟ اور تمہیں کہاں پہنچایا جائے......؟'' شکیل نے سوالیہ نظروں سے بختاور کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

بختاور نے کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کے ہونٹ صرف کپکپا کر رہ گئے۔ شکیل چند لمحے پُر خیال نظروں سے اس کی جانب دیکھتا رہا لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ پائی۔

''اوکے......! اوکے......! کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری پوری کہانی میں سمجھ چکا ہوں کیونکہ ان لوگوں میں سے ایک شخص کو میں پہچان گیا تھا۔ ٹھیک ہے...... تم بے فکر ہو کر آرام کرو۔ امید ہے صبح تک سنبھل جاؤ گی۔ یہاں تمہیں بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میں اب صبح ہی تم سے ملوں گا۔ اور صبح جہاں تم کہو گی تمہیں باحفاظت پہنچا دیا جائے گا۔'' یہ کہہ کر شکیل وہاں سے اٹھا اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

جو کچھ اس نے لڑکی سے کہا تھا نہ جانے کیوں اس کا دل و دماغ اس کے لفظوں کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔ پہلی نظر اس لڑکی کو دیکھتے ہی ایک عجیب سا احساس اس کے اندر پرورش پانے لگا تھا۔ لیکن وہ اپنی ان سوچوں کی حوصلہ افزائی نہیں کر سکتا تھا۔ لڑکی انتہائی خوبصورت تھی اور اسے اپنی کم روئی کا بخوبی احساس تھا۔

اس نے اپنے آپ کو سرزنش کی اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کرتے ہوئے گھر سے باہر نکل آیا۔ لیکن چلنے سے پہلے اپنی جیب کو تھپتھپا کر کسی چیز کی موجودگی کا

احساس کرنا نہیں بھولا تھا۔

دوسری صبح جب شکیل کمرے میں داخل ہوا تو ششدر رہ گیا۔ جو کچھ اسے نظر آیا وہ اس کی توقع کے بالکل برعکس تھا۔

جوں ہی وہ کمرے میں داخل ہوا لڑکی نے بھاگ کر اس کے پیر پکڑ لئے تھے۔ چند لمحے تک تو شکیل صورت حال کو سمجھ ہی نہیں پایا اور حیران پریشان کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔

پھر دھیرے دھیرے وہ نیچے جھکا اور لڑکی کے کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے کھڑا کر دیا۔ پھر وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

''اس حرکت کا مطلب......؟'' اور اس کی آنکھوں سے مینہ برسنے لگا۔

''کم از کم اپنا نام تو بتا دو......!'' شکیل نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا اور جب اس نے اشک بار آنکھیں اٹھا کر بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

''بختاور......!'' تو شکیل اس منظر میں کھو کر رہ گیا۔ اس نے ایک جھرجھری سی لی اور پھر اسے دھیرے دھیرے چلاتے ہوئے لے جا کر بیڈ پر بٹھا دیا۔

''کیا کہنا چاہتی ہو......؟'' شکیل نے سوال کیا۔ جواباً بختاور نے روتے بلکتے ہوئے اپنی پوری داستان کہہ سنائی۔ سب کچھ سننے کے بعد شکیل نے دریافت کیا۔

''تو کیا اب تم اپنے بابا کے پاس جاؤ گی......؟'' اور بختاور کے دل میں ایک ہوک سی اٹھی لیکن جواب دیئے بنا چارہ بھی نہ تھا۔

تمام رات بستر پر کروٹیں بدلنے کے بعد بختاور ایک نتیجے پر پہنچ چکی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اب شاید وہ کبھی اپنے بابا کا منہ نہیں دیکھ پائے گی۔ وہ گاؤں، وہ تھل، وہ سکھیاں، اب ان کو بھول جانے میں ہی اس کی بہتری تھی۔

اور اب بھلا وہ وہاں جاتی بھی تو کس منہ سے......؟ اس نے کہنا شروع کیا۔

''آپ ایک خوب صورت دل کے مالک ہیں۔ آپ نے جو احسان مجھ پر کیا اس کا قرض تو شاید میں مر کر بھی نہ چکا پاؤں۔ میں بھی کتنی خودغرض ہوں کہ پھر بھی...... آپ سے کچھ مانگ ہی رہی ہوں۔ اگر میں کچھ مانگوں تو کیا آپ دے پائیں گے......؟''

''اگر میرے بس میں ہوا تو شاید ضرور......!'' شکیل نے مختصراً کہا۔

''میری یہ زندگی آپ کی دی ہوئی ہے اور میں اپنی ساری زندگی آپ کی خدمت کرتے ہوئے گزارنا چاہتی ہوں۔ اگر آپ اس گھر کے کسی کونے میں مجھے تھوڑی سی جگہ عطا کر دیں تو بخت آور کہلاؤں گی۔'' شکیل کہنا چاہتا تھا۔

''بخت......! تم میرا بخت ہو، تمہاری جگہ اس گھر کے کسی کونے میں نہیں، بلکہ اس دل میں ہے۔ لیکن وہ ایسا کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

بس اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں حرکت میں آئے اور بختاور کے کندھوں پر جم گئے اور پھر بختاور اس کے مضبوط بازوؤں کے حصار میں سمٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

☆☆☆

آماج

''تڑاخ......!'' شیزہ کا ہاتھ گھوما تھا اور بوڑھی ملازمہ اچھل کر نیچے گر گئی۔
پاس ہی کھڑا اشرفو جو قینچی کی مدد سے پودوں کی کاٹ چھانٹ میں مصروف تھا، اس نے چونک کر ادھر دیکھا۔ وہ اس وسیع و عریض کوٹھی جسے ''شیزہ لاج'' کا نام دیا گیا تھا، میں پچھلے دو سال سے بطور مالی اپنے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس نے چند لمحوں تک جیسے صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کی، جوں ہی اسے معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا اس نے فوراً چہرہ گھما لیا اور پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

''ہونہہ......! بگڑے ہوئے باپ کی بگڑی ہوئی اولاد......!'' وہ بے اختیار بڑبڑا اٹھا۔

اسے بوڑھی بانو کے ساتھ شیزہ کا یہ سلوک پسند نہیں آیا تھا اور اسے ہی کیا چوکیدار زمان خان، خانساماں، انور علی اور گھر کی صفائی ستھرائی پر مامور ملازمہ ثریا کو بھی اس کے یہ انداز و اطوار ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے۔ لیکن وہ سب کے سب جانتے تھے کہ ''نوکر کی تے نخرہ کی'' نوکر انسان تھوڑی ہوتے ہیں۔ وہ تو بے چارے بھیڑ بکریوں کی طرح بے زبان قسم کی مخلوق ہوتے ہیں، جن کو نہ تو زیادہ سننے کی اجازت ہوتی ہے اور نہ ہی لب کشائی کی۔ سب کچھ دیکھتے ہوئے بھی آنکھیں بند

رکھنے والے لوگ ہی اعلیٰ پائے کے ملازم ثابت ہوتے ہیں۔ شرفو نے آزردگی سے سوچا۔

اس کے اندر کی کیفیات جو بھی رہی ہوں، لیکن مجال تھی کہ ان خیالات کے عکس کی معمولی سی جھلک بھی اس کے چہرے سے ظاہر ہو جاتی۔ وہ اس طرح سے اپنے کام میں مصروف تھا جیسے کچھ ہی فاصلے پر موجود چیختی چنگھاڑتی شیزہ کے وجود سے یکسر لاعلم ہو اور اسی کا نام تو نوکری تھا، مالکوں کی کسی بات میں وہ کوئی دخل دے بھی تو نہیں سکتا تھا۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ ادھر شیزہ، بانو پر برس رہی تھی۔

''جب تمہیں پتا ہے کہ میں ٹھیک گیارہ بجے بیڈ ٹی لیتی ہوں تو تم چائے لے کر کیوں نہیں آئیں ایڈیٹ......! ڈیڈی نے بھی اس گھر کو چڑیا گھر بنا رکھا ہے، بھانت بھانت کے ملازم بھرتی کر رکھے ہیں، جنہیں وقت کی پابندی کا کچھ احساس ہی نہیں...... نان سینس......!'' اس نے غصے سے پاؤں پٹخے اور پھر بکتی جھکتی واپس اپنے بیڈ روم کی طرف چلی گئی۔ بانو نے زمین پر بکھرے ہوئے وجود کو سمیٹا اور پھر کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اب وہ فرش پر بکھرے ہوئے کپ کی کرچیاں اکٹھی کر رہی تھی جو شیزہ کا تھپڑ وصول کرنے سے قبل اس کے ہاتھ میں تھا اور اب ٹکڑوں کی شکل میں بٹ چکا تھا۔

''زیادہ چوٹ تو نہیں آئی بانو......!'' شرفو نے ہمدردی سے پوچھا۔

''چوٹ تو دل پر لگی ہے شرفو......! گاؤں میں میری بیٹی کے گھر والے نے اسے مار مار کر ادھ موا کر دیا ہے۔ نشہ کر کے آتا ہے اور میری پھول سی معصوم زبیدہ کو دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ بے چاری مار کھا کھا کر اب تو جینے کے لائق ہی نہیں رہی۔ اسی کا فون آ گیا تھا، جس کے دکھڑے سنتی میں بدنصیب آج چائے دینے میں دس منٹ کی دیر کر بیٹھی اور شیزہ بی بی نے......'' بانو سسکیاں لیتے ہوئے رونے لگی۔

''رو مت پگلی......! غریب تو پیدا ہی مار کھانے کے لئے ہوتا ہے۔ کبھی

غربت کی، کبھی تقدیر کی، تو کبھی ان صاحب لوگوں کی، یہ ساری مقدروں کی کھ
ہے، تو دل چھوٹا نہ کر۔ جا...... جا کے اور چائے بنا کر شیزہ کو دے۔'' بانو اپنی آستین
سے آنسو پونچھتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ شرفو اپنا کام ختم کر چکا تھا۔ اور اب
اسے حسب دستور چوکیدار زمان خان سے گپیں لگانے کے علاوہ اور کوئی کام نہ تھا۔

''یار زمان خان ......! یہ اپنی شیزہ بی بی بہت ہاتھ چھٹ ہیں۔ ابھی اپنی
ماں کی عمر کی بے چاری بانو کو ایسا زناٹے دار تھپڑ رسید کیا کہ وہ بے چاری کتنی دیر
تک زمین سے اٹھ ہی نہ سکی۔'' شرفو کے لہجے میں دکھ ہی دکھ جیسے کوٹ کوٹ کر بھرا
ہوا تھا۔ زمان خان نے اپنے مخصوص انداز میں شرفو کی طرف دیکھا اور پھر مونچھوں
پر ہاتھ پھیرتے ہوئے گویا ہوا۔

''اوے خوچے......! تم تو ابی دو سال سے ادر نوکری موکری کرتی ہے، ام
پچھلا آٹھ سال سے ادر نوکری کرتی ہے۔ شیزہ میم صاب سب کا ساتھ یہ ہی سلوک
کرتا ہے۔ تین سال پہلے اس نے رشید بٹلر کو اتنا مارا تھا کہ بے چاری کا ایک آنکھ
ضائع ہو گیا۔ پھر اس کے بعد کھانساماں انور علی بھی دو تین بار شیزہ میم صاب سے
تھپڑ کھا چکی ہے۔ ام تو میم صاب کا سامنے ہی نہیں جاتا۔'' چوکیدار زمان خان نے
شرفو کی معلومات میں اضافہ کیا۔ تو وہ حیران نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہ
گیا۔ پھر ایک لمحہ توقف کے بعد شرفو دوبارہ گویا ہوا۔

''یہ تو ظلم ہے یار......! بڑے صاحب بھی کچھ نہیں کہتے......؟''

زمان خان نے پوری توجہ سے اس کے الفاظ کو سنا، ایک مرتبہ پھر مونچھوں کو
سہلایا، شاید بار بار ہاتھ لگا کر وہ یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا تھا کہ مونچھیں ابھی
تک اس کے چہرے پر ہی موجود ہیں یا کہیں فرار ہو گئیں۔

پھر مطمئن ہو کر جیب سے نسوار کی ڈبیا نکالی اور پھر نسوار کا گولا سا بنا کر
اپنے نچلے ہونٹ کے نیچے دباتے ہوئے مفکرانہ انداز میں بولا۔

''یار......! شرفو خاناں......! یہ صاب لوگ اپنی عورتوں سے بہت ڈرتی ہے،

وہ کچھ نہیں بولتی، ام لوگو کو اپنا حفاظت خود کرنا پڑتا ہے، سمجھا......!'' اور شرفو محض سر ہلا کر رہ گیا۔ اس بات سے بے خبر کہ ان سے کچھ ہی فاصلے پر کھڑے سیٹھ راشد ان کی گفتگو سن چکے تھے۔

☆☆☆

اکانومی کلاس کا یہ اپارٹمنٹ اس وقت کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ ٹرین اپنی پوری رفتار سے دوڑی چلی جا رہی تھی۔ جینز اور جیکٹ میں ملبوس وہ خوب صورت لڑکی چار سواریوں کے لئے مخصوص اس سیٹ کی کھڑکی والی سائیڈ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے لمبے کھلے لائٹ براؤن بال کھڑکی سے آنے والی ہوا کی وجہ سے بار بار بکھر کر اس کے سرخ سپید چہرے پر پروانہ وار نثار ہو رہے تھے۔ لیکن وہ بار بار صحیح کرنے کے انداز میں انہیں واپس سمیٹ لیتی۔

برابر کی سیٹوں پر بہت سے لوگوں کا ایک جم غفیر تھا۔ اس کی سیٹ پر بھی اس کے قریب ایک دھان پان اور منحنی سے وجود والی عورت براجمان تھی۔ جس کے ساتھ آٹھ نو بچے بھی تھے جن کو اس نے زبردستی وہاں پھنسا رکھا تھا۔

برتھ کے اوپر بھی تین بچے موجود تھے۔ دو تین اس کے ساتھ ہی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے اور ایک ننھا سا بچہ اس کی گود میں بھی تھا۔ اس کی نظر اس قافلے سے ٹکرائی تو وہ حیران رہ گئی۔ نو کے نو بچے سال سال کی درجہ بندی کے مطابق تھے۔

وہ دل ہی دل میں اس عورت کی ہمت و استقامت کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکی اور پھر اتنے سارے بچوں کی نگہداشت بھی تو مسئلہ کشمیر سے کم نہ تھی......؟ لیکن بہر حال ایسا ہوتا تو تھا۔ نہ جانے اور کتنی عورتیں اسی طرح کی زندگی گزار رہی تھیں۔ جن میں سے ایک شاید وہ بھی تھی۔

اور سب سے حیرت کی بات یہ تھی کہ سارے کے سارے بچے بالکل پرسکون تھے اور بچے تو بچے اور موصوفہ خود بھی خاصی مطمئن دکھائی دیتی تھیں۔ وہ بار

بار شاید غنودگی کے عالم میں جھولے کھاتے ہوئے اس کے وجود سے ٹکراتی اور پھر یک دم ہڑبڑا کر سیدھی ہو جاتی۔ لیکن زیادہ دیر تک سیدھی بیٹھی نہ رہ سکتی اور آہستہ آہستہ جھولے لیتے ہوئے پھر اس کے وجود سے ٹکراتی لڑکی شاید اس صورت حال سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ کیونکہ جوں ہی منحنی وجود کی اس عورت کا سر جھولا کھا کر اس کے کندھے سے ٹکراتا اس کے ہونٹ سکڑ جاتے۔ وہ ناپسندیدہ نظروں سے اس کمزور عورت کی طرف گھورتی، لیکن اس اثنا میں وہ عورت سیدھی ہو جاتی۔ لیکن بہرحال لڑکی خاصی کوفت محسوس کر رہی تھی۔

عورت کا سر ایک مرتبہ پھر اس کے کندھے پر آٹکا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے اسے گھورا، لیکن عورت اس مرتبہ شاید ہڑبڑانا بھول گئی تھی۔ وہ مزے سے اس کے کندھے پر سر ٹکائے یوں آرام فرما رہی تھی جیسے شاید اپنے بیڈ روم میں نرم و گداز بستر پر لیٹی مخملیں تکیے پر سر ٹکائے محو استراحت ہو، اور اس کی آسودگی کا یہ عالم تھا کہ وہ باقاعدگی سے ہلکے ہلکے خراٹے بھی نشر کر رہی تھی۔ چند لمحوں کے انتظار کے بعد شاید لڑکی کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ اس نے غصیلے انداز میں عورت کو بری طرح جھنجوڑ ڈالا۔ عورت ہڑبڑا کر بدحواس انداز میں سیدھی ہوئی اور اس کے حلق سے بے ربط سے جملے برآمد ہوئے۔

''کک...... کک...... کون...... کون......؟ کون ہے......؟ کون ہے......؟''

''میڈم......! یہ کندھا میرا ہے۔ آپ کے اس محبوب شوہر کا نہیں جس کی یاد میں آپ ان بچوں کو تمغوں کی صورت میں سجائے پھر رہی ہیں۔'' لڑکی نے اپنا کندھا تھپکتے ہوئے دانت پیس کر کہا اور وہ عورت ہونقوں کی طرح منہ کھولے اسے دیکھ کر رہ گئی پھر شاید بات پوری طرح اس کی سمجھ میں آگئی۔

''اے ہائے......! کیسی باتیں کر رہی ہو......؟ یاد میں کیوں......؟ اللہ تندرستی دے میں تو ان کی محبت میں لئے پھر رہی ہوں۔ ان معصوموں کو۔ اگر میرے اجمل کی طرح تمہارا بھی کوئی اتنی محبت کرنے والا شوہر ہوتا تو تم بھی آٹھ

دس تمغے تو ضرور لئے پھرتیں پھر پوچھتی میں تم سے۔" عورت نے تنتناتے ہوئے جواب دیا اور لڑکی اس منہ پھٹ عورت کی اس بیہودہ گوئی پر گڑبڑا کر رہ گئی لیکن دوسرے ہی لمحے اس کی پیشانی پر بل نمودار ہوگئے۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بھڑکتے ہوئے بولی۔

"زبان سنبھال کر بات کرو بڑی بی......! اپنے تمغے اور اپنا اجمل اپنے پاس رکھو۔ مجھ سے زبان چلانے کی کوشش کی تو تمغوں سمیت اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دوں گی۔ اور اجمل کو تمہارے مزار پر دیا جلانے کی حسرت ہی رہ جائے گی۔ بلیک بیلٹ ہوں میں کراٹے میں۔ سمجھیں......!" لڑکی جیسے ہتھے سے اکھڑ گئی تھی اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اگر عورت مزید کچھ بولی تو وہ واقعی اسے اٹھا کر گاڑی سے باہر پھینک دے گی۔

عورت منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے ہوئے اپنی جگہ دبک کر رہ گئی تھی۔ چند لمحوں تک لڑکی نے وہیں کھڑے ہو کر انتظار کیا لیکن جب عورت کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا تو وہ دوبارہ اپنی سیٹ پر بیٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

کارنس پر رکھا ہوا تاج محل کا وہ خوب صورت ماڈل جو شاید سنگ مرمر کا بنا ہوا تھا، ایک دھماکے کی آواز کے ساتھ نیچے گرا اور ٹوٹ کر کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ دھماکے کی اس آواز پر وہ بیڈ پر سے یوں اچھلی تھی جیسے اس کے نیچے اسپرنگ لگے ہوئے ہوں۔ اس نے حیرت اور دکھ کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ٹکڑوں کی شکل میں بکھرے ہوئے اس حسین تاج محل کی طرف دیکھا جو اب وجود سے عدم وجود میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اسے اس تاج محل سے بہت لگاؤ تھا۔ جو تین سال پہلے اس کی کلاس فیلو اور سب سے عزیز دوست حنا نے اسے اس کی برتھ ڈے کے موقع پر گفٹ کیا تھا۔ کچھ عرصہ پہلے حنا کی شادی ہوگئی تھی اور وہ اپنے شوہر اللہ بخش فریدی کے ساتھ اس

کا شہر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر اپنے اللہ بخش فریدی کے آبائی شہر اوکاڑہ سیٹل ہوگئی تھی اور ایک دفعہ اوکاڑہ کیا گئی یوں لگا کہ دنیا ہی چھوڑ گئی۔

کیونکہ اس دن کے بعد سے لے کر آج تک وہ دوبارہ اس کی شکل نہیں دیکھ پائی تھی۔ صرف تاج محل کا خوب صورت ماڈل ہی اس کی ایک واحد یادگار تھا۔ جو نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہ تو ٹکڑوں کی شکل میں فرش پر بکھرا اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ حیرت، افسوس، دکھ، جیسی کیفیات سے گزرنے کے بعد اب اس پر ایک ہی کیفیت باقی رہ گئی تھی، غصے کی۔

شدید غصے کی حالت میں اس نے اس کے ٹوٹنے کا سبب جاننے کے لئے اردگرد نظریں دوڑائیں تو وہ سبب جلد ہی اس کی سمجھ میں آ گیا۔ کیونکہ کمرے کے ایک کونے میں سکڑی سمٹی ہوئی ثریا اسے نظر آ گئی تھی جو ہاتھ میں کپڑا تھامے ڈری ڈری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

وہ ایک جنون کے عالم میں اس پر جھپٹی اور اسے بری طرح زد و کوب کرنے لگی۔ تھپڑ، لاتیں، گھونسے اور بے تحاشا اسے پیٹ رہی تھی اور سولہ سترہ سالہ وہ کمزور ملازمہ ثریا اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بچاؤ کی ناکام کوشش کرتے ہوئے فریاد کناں تھی۔

''بی بی جی......! میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا۔ میں...... وہ صفائی کر رہی تھی جی...... وہ کپڑا اس میں الجھ گیا۔ مت ماریں بی بی جی......! یقین کریں میں نے جان بوجھ کر نہیں توڑا۔'' لیکن وہ تو جیسے بہری ہو چکی تھی اور ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ غصے کی شدید کیفیت کے وقت اسے اپنے آپ پر قابو ہی کہاں رہتا تھا......؟ اور اس وقت بھی غصے کی زیادتی نے اس کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب کر لی تھیں۔

وہ دیوانہ وار اسے مار رہی تھی اور بے چاری ثریا واویلا مچاتے ہوئے کسی فٹ بال کی طرح کمرے میں ادھر سے ادھر لڑھکتی پھر رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار کی

آوازیں سن کر شرفو، بانو اور انور علی بھی کھلے ہوئے دروازے تک آن پہنچے تھے اور وہیں کھڑے ہوئے بے چاری ثریا کی درگت بنتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اتنی جرأت ان میں سے کسی میں بھی نہ تھی کہ وہ کھلے ہوئے دروازے کو کراس کر کے شیزہ کے کمرے میں داخل ہوتے اور اسے اس کی دیوانگی سے باز رکھ سکتے۔

شیزہ نے اپنے گھٹنے کو موڑ کر پوری قوت سے ثریا کی کمر میں رسید کیا تو وہ بری طرح اچھل کر بیڈ سے ٹکرائی اور نیچے زمین پر آ رہی۔ ٹھیک اسی لمحے دروازے پر کھڑے نظارہ کرتے ملازموں میں ہلچل سی پیدا ہوئی، انہوں نے بے اختیار ایک سمت ہٹتے ہوئے کسی کو راستہ دیا تھا۔

خوب صورت تراش کے ہلکے گرے کلر کے ٹو پیس سوٹ میں ملبوس پچاس پچپن سالہ بارعب شخصیت سیٹھ راشد کے علاوہ اور کسی کی نہ تھی جو شیزہ کے والد تھے۔ وہ جیسے بھاگتے ہوئے سے کمرے میں داخل ہوئے تھے۔ ٹھیک اسی وقت شیزہ نے ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا سنگ مرمر کا بنا ہوا وہ خوب صورت مجسمہ اٹھایا اور اس کا ہاتھ ہوا میں بلند ہوتا چلا گیا۔

''رک جاؤ......!'' سیٹھ راشد بلند آواز میں دھاڑے تھے لیکن تب تک تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ شیزہ نے وہ چھوٹا سا خوب صورت لیکن وزنی سنگی مجسمہ زمین پر پڑی ثریا کے سر میں دے مارا تھا اور اس کے سر میں روشن دان کھل گیا تھا۔ اس کے سر سے خون بھل بھل بہہ رہا تھا۔

☆☆☆

لڑکیوں کا ایک جم غفیر تھا جو اس وقت اس بڑے ہال نما کمرے میں موجود تھا۔ سب اپنی نشستوں پر براجمان ایک دوسرے سے خوش گپیوں میں مصروف تھیں۔ جب جینز اور جیکٹ میں ملبوس کھلے بالوں کے ساتھ وہ خوب صورت الٹرا ماڈرن لڑکی وہاں داخل ہوئی اور ہال میں یک دم سناٹا سا پھیل گیا۔ آپس میں

گفتگو کرتی سبھی لڑکیاں چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوگئی تھیں۔

آنے والی نے ایک طائرانہ سی نظر وہاں موجود کم و بیش سولہ سترہ لڑکیوں پر ڈالی جو سب کی سب عجیب سی نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے لاپرواہی سے کندھے اچکائے اور ایک کونے میں موجود خالی نشست کی طرف بڑھ گئی اور پھر آرام سے اس پر قبضہ جماتے ہوئے ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی۔ اس نے وہاں موجود لڑکیوں کو یوں نظر انداز کر دیا تھا جیسے وہ اس کے نزدیک کیڑے مکوڑوں سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی ہوں۔

لڑکیوں نے بھی اس کی اس بے اعتنائی کو محسوس کر لیا تھا اور اب وہ اس کی طرف کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں شاید انہیں یہ لڑکی بہت عجیب لگی تھی اور تھا بھی ایسا ہی...... کیونکہ وہاں موجود سبھی لڑکیوں نے بھڑکیلے اور شوخ کلر کا لباس پہنے ہوئے تھے لیکن ظاہر ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی جینز اور جیکٹ زیب تن نہیں کی ہوئی تھی۔

میک اَپ اور بناؤ سنگھار پر خصوصی توجہ دی گئی تھی بلکہ ان میں سے بعض تو شاید سیدھی بیوٹی پارلر سے ہو کر آ رہی تھیں لیکن اس کا چہرہ میک اَپ سے یکسر بے نیاز تھا۔ اس کا لباس سادہ لیکن ان سب سے بہت مختلف تھا۔ اس کے باوجود وہ لڑکی ان سب میں نمایاں اور خوب صورت نظر آ رہی تھی۔

لیڈی سیکرٹری کی جاب تھی جس کا اشتہار اخبار میں چھپا تھا۔ انٹرویو کی ڈیٹ اور ٹائم کے مطابق وہ سب کی سب ایک سے بڑھ کر ایک تیاری کے ساتھ آئی تھیں پھر ان کی کھسر پھسر کو اس وقت یک دم بریک لگ گیا جب ایک چپڑاسی نما آدمی نے آ کر انہیں انٹرویو شروع ہونے کی اطلاع دی اور پھر اس کے بعد ایک کے بعد ایک تمام کی تمام لڑکیاں کمرہ امتحان کی طرف جاتیں اور ایک مخصوص وقت کے بعد واپس نمودار ہو کر ہال کمرے سے باہر نکلتی گئیں۔

لڑکیوں کی تعداد تیزی سے کم ہوتی چلی گئی پھر تقریباً گیارہویں نمبر پر اس

کی باری آئی۔ اور وہ اٹھ کر اندرونی حصے کی سمت بڑھ گئی۔ اس کی واپسی مقررہ وقت کی نسبت کچھ تاخیر سے ہوئی تھی۔ اس نے ایک نظر رک کر باقی ماندہ لڑکیوں کی طرف دیکھا اور پھر پُراعتماد لہجے میں ان سے مخاطب ہوئی۔

''فیصلہ ہو چکا ہے......تم لوگ یہاں بیٹھ کر وقت ضائع نہ کرو۔ بہتر ہے کہ واپسی کا راستہ ناپو......!'' لڑکیوں نے حیرت سے اس کے ان الفاظ کو سنا لیکن وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں اس کا یہ جملہ ایک دیوانے کی بڑ سے زیادہ حیثیت کا حامل نہیں لگا تھا۔ وہ رک کر چند لمحے ان کی طرف دیکھتی رہی لیکن جب کوئی ردعمل ظاہر نہ ہوا تو بے نیازی سے کندھے اچکاتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

لڑکیاں یہ بات محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں کہ اس کی چال میں ایک عجیب سی تمکنت اور وقار تھا۔ ایک انوکھا سا احساس تفاخر تھا۔ وہ نپے تلے قدم اٹھاتی ہال کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ نوکری اسے مل چکی ہے۔

☆☆☆

شیزہ کی حالت اس وقت کسی زخمی شیر سے کم نہ تھی۔ وہ غصے سے ہونٹ کاٹتے ہوئے تیزی سے دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ اسے اپنے ڈیڈی پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ انہوں نے زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تھپڑ مارا تھا۔

ثریا کی حالت ابھی تک خطرے سے باہر نہیں تھی اور وہ اسپتال کے انتہائی نگہداشت وارڈ میں زندگی اور موت کی جنگ لڑ رہی تھی لیکن اسے اس بات کی کوئی فکر نہیں تھی۔ کوئی پرواہ نہیں تھی کیونکہ اسے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کہ ثریا مرے یا جیئے......

فرق پڑا تھا تو یہ کہ اس کے ڈیڈی نے زندگی میں پہلی بار اس پر ہاتھ اٹھایا

تھا۔ اسے تھپڑ مارا تھا۔ اور یہ سب اس بدذات ثریا کی وجہ سے ہوا۔ یہ سوچتے ہی اس کا خون کھول اٹھا۔

''نوکروں کا کیا ہے۔ ایک نہیں تو دوسرا سہی۔ اگر ثریا نہیں رہتی تو کوئی بشریٰ، جمیلہ یا ہاجرہ اس کی جگہ لے لیتی...... بھلا ان کی حیثیت ہی کیا ہے......؟''

''ہونہہ......! غریب اور بے کار لوگ......!'' اس نے نفرت سے سوچا اور اس کے ہونٹ نیم دائرے کے انداز میں سکڑتے گئے۔

''بھلا میرا اور ان کا مقابلہ......؟ ہمارے اسٹیٹس اور ان کے اسٹیٹس میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ہم لوگ پیسہ پھینکتے ہیں اور یہ لوگ دم ہلاتے ہیں...... پھر کیوں......؟ آخر کیوں......؟ اس کے ڈیڈی نے ایک ملازمہ کی فیور کرتے ہوئے اسے تھپڑ مارا تھا...... آخر انہوں نے ایسا کیوں کیا......؟'' اس نے حیرت سے سوچا۔

''اس عورت نے میرا اتنا قیمتی ڈیکوریشن پیس توڑا...... اگر میں نے اس کا سر توڑ دیا تو کیا غلط کیا......؟'' وہ آپ ہی آپ سوچتی اور الجھتی رہی۔ اسے بار بار اپنے ڈیڈی پر غصہ آ رہا تھا۔ جب جب وہ اس سچویشن کو یاد کرتی، اسے اپنے ڈیڈی کے اس تھپڑ کی گونج اپنے پورے وجود میں سنائی دیتی اور اس کے ساتھ ہی اسے ثریا پر بھی شدید غصہ آتا۔ اس کی وجہ سے تو ایسا ہوا تھا۔

''تڑاخ......!'' سیٹھ راشد کا ہاتھ گھوما تھا اور ان کے ہاتھ کی انگلیاں شیزہ کے چہرے پر نقش ہوگئی تھیں۔ آج تک وہ ملازموں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتی آئی تھی۔ انہیں مار پیٹ کر اور اذیت دے کر اسے ایک عجیب سی خوشی ملتی تھی۔ احساس برتری کا ایک انوکھا سا نشہ اور حکمرانی کا ایک عجیب لذت آمیز خمار اس کے پورے وجود میں، رگ رگ میں، سرائیت کر جاتا تھا۔

اور ایسا آج سے نہیں وہ تو بچپن سے ہی یہ احساس لے کر جوان ہوئی تھی کہ ملازمین ان کی رعایا ہیں اور وہ ان کی حکمران......! ان زرخرید غلاموں کے

ساتھ ہر طرح کا سلوک اس کے نزدیک جائز ٹھہرا تھا۔

اپنی ماما کی ڈیتھ کے بعد وہ روئی نہیں تھی۔ شاید اسے دکھ بھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس کے مزاج میں ایک عجیب سی تبدیلی ضرور رونما ہوگئی تھی۔ اب وہ کھلونوں سے نہیں کھیلتی تھی بلکہ اب وہ لان میں موجود پھولوں کے پودوں پر بیٹھی تتلیوں سے کھیلتی تھی۔ وہ گھنٹوں وہیں بیٹھی رہتی۔ رنگ برنگی خوشنما تتلیوں کو پکڑنا ان کے پر نوچنا اور پھر ان کو تڑپا تڑپا کر مار دینا اس کا دل پسند مشغلہ تھا۔ ایسا کیوں تھا......؟ یہ تبدیلی اس میں کیوں آئی تھی......؟ نہ کبھی اس نے سوچا تھا اور نہ کبھی اسے اس کی ضرورت پیش آئی تھی۔

اپنی اسی فطرت کے ساتھ اس نے بچپن کی سرحدیں عبور کرتے ہوئے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا لیکن اب اس مشق ستم کا شکار ہونے والے پرندے اور تتلیاں نہیں تھے بلکہ اب اپنی اذیت پسند فطرت کی تسکین کے لئے ملازم تختہ ستم ٹھہرتے تھے اور آج تک کسی نے اف تک نہیں کی تھی۔ کسی قسم کا کوئی احتجاج تو درکنار، کبھی کسی نے اس کے سامنے بولنے کی بھی جرأت نہیں کی تھی لیکن آج اسے اپنے ڈیڈی کا تھپڑ برداشت کرنا پڑا تھا۔

''انف از انف......! اب تم بچی نہیں رہیں تمہیں اپنے آپ کو بدلنا ہوگا۔'' سیٹھ راشد غصیلے انداز میں دھاڑے تھے۔ اس کے وجود کو جیسے ایک جھٹکا سا لگا اس نے کمرے میں ٹہلنا بند کر دیا۔ اب وہ ایک جگہ کھڑی ہو چکی تھی۔ شاید وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکی تھی پھر اس کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ سی مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔

''ہاں......! مجھے بدلنا ہوگا...... لیکن ڈیڈی......! اس کے لئے آپ کو بہت کچھ کھونا پڑے گا...... میں اپنے آپ کو ضرور بدلوں گی ڈیڈی لیکن اس کے لئے آپ کو بہت کچھ بدلنا پڑے گا...... بہت کچھ......!'' وہ بڑبڑائی اس کے ہونٹوں پر وہی مخصوص اور طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ پھر وہ آرام سے ایزی چیئر پر بیٹھتے ہوئے ایک لخت چلائی۔

''بانو......!'' اور بانو چند ہی لمحوں میں آموجود ہوئی۔

''جی بی بی جی......!'' اس نے مؤدبانہ انداز سے پوچھا۔

''ڈیڈی کہاں ہیں......؟'' شیزہ نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

''جی وہ تو آفس چلے گئے۔'' بانو منمنائی تھی۔

''اچھا ٹھیک ہے......تم جاؤ......!'' اس نے جھٹکے دار آواز میں کہا۔

بانو خاموشی سے مڑی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں تک وہ ایزی چیئر پر سر ٹکائے پُرخیال انداز میں جیسے کچھ سوچتی رہی پھر آہستہ سے اٹھی اور وارڈروب کی جانب بڑھ گئی۔ اپنے لئے اس نے جینز اور جیکٹ کا انتخاب کیا تھا پھر اس نے ایجوکیشن سے متعلق اپنے ڈاکومنٹس نکالے۔ انہیں چھوٹے سے ہینڈ بیگ میں احتیاط سے رکھا۔ جس میں اس کے ایک دو سوٹ پہلے سے موجود تھے۔ پھر وہ لان میں سے ہوتی ہوئی گھر کے بیرونی دروازے تک جا پہنچی۔ ہینڈ بیگ اس کے ہاتھ میں تھا۔

''زمان خان......! گیٹ کھولو......!'' یک لخت اس کی آواز بلند ہوئی اور زمان خان نے ''جی میم صاب......!'' کا نعرہ بلند کرتے ہوئے مستعدی سے گیٹ کھول دیا۔

شیزہ نے آرام سے گیٹ کراس کیا اور ایک جانب پیدل روانہ ہوگئی۔ اس نے گاڑی لینے یا ڈرائیور کو زحمت دینے کے بارے میں نہیں سوچا تھا۔ کچھ دور تک وہ پیدل ہی چلتی چلی گئی جب کوٹھی سے اس کا فاصلہ کافی حد تک مناسب ہوگیا تو وہ رک گئی۔ اس نے گزرتے ہوئے ایک رکشہ کو روکا اور پھر اس میں براجمان ہوتے ہوئے بولی۔

''اسٹیشن چلو......!''

☆☆☆

خالد گجران دنوں بہت خوش تھا اور کیوں نہ ہوتا......؟ اس نے مدتوں سے

جاری اپنے خاندانی کام سے بغاوت کی تھی۔ دودھ بیچنا ان کا آبائی پیشہ تھا اور بھینس ان کا مونوگرام لیکن اسے یہ پسند نہیں تھا۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود اس نے تعلیم حاصل کرنے پر پوری توجہ دی تھی۔ میٹرک کے بعد اس نے شہر جا کر مزید تعلیمی سلسلہ پوری تندہی سے جاری رکھا بزنس ایڈمنسٹریشن میں ماسٹر کرنے کے بعد اس نے اپنے بوڑھے ماں باپ کے احتجاج کے باوجود ساری بھینسیں بیچ ڈالی تھیں اور ان سے حاصل ہونے والی رقم سے شہر آ کر اس نے امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس شروع کیا تھا۔

اور حیرت کی بات یہ تھی کہ گجر ہونے کے باوجود اس کا بزنس چل نکلا تھا۔ شاید یہ اس کی ڈگری کا کمال تھا جو اس نے پوری محنت اور جاں فشانی کے ساتھ بزنس ایڈمنسٹریشن کے نام سے حاصل کی تھی۔

اب اس کا باقاعدہ ایک دفتر تھا، اسٹاف تھا اور وہ باقاعدگی سے آفس جاتا تھا۔ گاؤں سے اس نے اپنا تعلق بالکل ختم کر لیا تھا۔ پھر اس نے مزید ترقی کی۔ اب اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ کار خرید لی تھی۔ اسے بہت خوشی ہوئی۔ شاید اس سے بھی زیادہ جتنی کہ اس کے ابا کو ایک نئی بھینس خرید کر ہوتی تھی۔

اب اس نے ڈرائیونگ سیکھنا بھی شروع کر دی تھی لیکن صاف ظاہر ہے کہ ہر کام میں کچھ نہ کچھ وقت تو ضرور لگتا ہے۔ اس کی خواہش یہی تھی کہ وہ جلد سے جلد اس قابل ہو جائے کہ گاڑی خود ڈرائیو کر کے گاؤں جا سکے اور ان سے کہے کہ بھینس کے ساتھ بھینس ہو کر رہنے والو......! دیکھو، زندگی اسے کہتے ہیں۔

دو تین دن سے وہ اپنی پوری کوشش کر رہا تھا لیکن ظاہر ہے کہ دو تین دن میں کوئی ایکسپرٹ ڈرائیور تو نہیں بن سکتا نا......؟ ادھر آفس میں بھی اسے پورا وقت دینا پڑتا تھا اور آفس کے بعد جتنا وقت اسے مل پاتا وہ ڈرائیونگ اسکول کی نذر ہوتا۔ ان دنوں وہ سخت مصروف تھا۔

آج بھی وہ آفس پہنچا اور تمام اسٹاف کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے

کمرے میں آ بیٹھا پھر اس نے بیل بجائی تو چپڑاسی آن وارد ہوا۔ اس نے چپڑاسی کی طرف گھورتے ہوئے سوال کیا۔

''مس شیزہ آج بھی ابھی تک نہیں پہنچیں......؟'' اس کے انداز سے یہ ظاہر ہو رہا تھا جیسے شیزہ کے دیر سے آنے میں سارا قصور چپڑاسی ہی کا ہو۔ لیکن وہ بے چارہ کر ہی کیا سکتا تھا......؟ وہ تو شیزہ کے سامنے بولنے کی جرأت بھی نہ کر پاتا تھا۔ اس کا انداز تھا ہی ایسا انوکھا۔ ایک عجیب شان اور وقار کے ساتھ وہ آفس میں داخل ہوتی۔ تمام اسٹاف کے ساتھ اس کا رویہ ایسے ہوتا جیسے وہ اس آفس کی ملازم نہیں بلکہ مالکن ہو۔ جس کو جی چاہتا جھاڑ دیتی۔ دل چاہتا تو کسی کی بات کا جواب دیا ورنہ ڈانٹ دیا اور کس کی مجال تھی کہ اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت کرتا......؟ مرضی سے آتی تھی اور مرضی سے جاتی تھی وہ ہر کام آفس کے ٹائم ٹیبل کی بجائے اپنے ٹائم ٹیبل کے مطابق کرتی تھی۔ چپڑاسی بے چارہ کس کھیت کی مولی تھا......؟

''یس سر......! وہ تو ابھی ایک گھنٹے بعد آئیں گی۔'' چپڑاسی نے مؤدبانہ انداز میں جواب دیا۔

''دفع ہو جاؤ......!'' خالد دھاڑ اٹھا۔ اس کا دماغ گھوم گیا تھا۔ گجر تو وہ پہلے ہی تھا بس سٹک گئی آج اسے شیزہ پر شدید غصہ آ رہا تھا۔ اس نے بلاوجہ فائلیں اٹھا کر ان سے سر کھپائی شروع کر دی۔ کافی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور شیزہ نمودار ہوئی۔

''گڈ مارننگ سر......!'' اس کی آواز بلند ہوئی۔

''مارننگ......؟'' اس نے فائل سے نظریں اٹھاتے ہوئے پھاڑ کھانے والے انداز میں جواب دیا۔

شیزہ آرام سے اپنی نشست پر براجمان ہوگئی۔ اس نے خالد کے لہجے یا رویے کو ذرا بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا تھا اور خالد کو مزید تپ چڑھ گئی۔ سوئی تو پہلے

ہی ہٹی ہوئی تھی۔ یک لخت اس کی آواز بلند ہوئی۔

''شیزہ......! تم اپنے آپ کو سمجھتی کیا ہو......؟ اس آفس کا مالک میں ہوں یا تم......؟ جب میں اور میرا پورا اسٹاف ٹھیک نو بجے آفس میں موجود ہوتے ہیں تو تمہارا دیر سے آنے کا مقصد......؟'' شیزہ نے اطمینان سے اس کی جانب دیکھا اور پھر گویا ہوئی۔

''میں ہر کام اپنی مرضی سے کرنے کی عادی ہوں اور یہ میری عادت ہے۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہوگا۔

تم ہی کو چاہتے ہیں ہم تم ہی سے پیار کرتے ہیں
یہی برسوں سے عادت ہے اور عادت کب بدلتی ہے''

اس کے لہجے میں سکون ہی سکون تھا۔

''دیکھو میڈم......! یہاں جاب کرنی ہے تو آپ کو اپنی یہ عادتیں بدلنا ہوں گی۔ اس آفس کے اصولوں کے مطابق چلنا ہوگا...... سمجھیں آپ......!'' خالد نے بھنائے ہوئے لہجے میں کہا اور شیزہ کے ہونٹوں پر وہی مخصوص طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی جو بعض اوقات اس کی شخصیت کا حصہ معلوم ہوتی تھی۔

''یس سر......!'' اس نے مختصر جواب دیا۔ اب وہ سوچ رہی تھی۔

''عادتیں تو میں بدل لوں گی...... لیکن اس کے لئے بہت کچھ بدلنا پڑے گا...... بہت کچھ......!''

☆☆☆

آف وائٹ کلر کی ٹوڈی کرولا کار سڑک پر پوری رفتار سے بھاگی چلی جا رہی تھی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر جینز اور جیکٹ میں ملبوس سنہرے بالوں والی ایک خوب صورت لڑکی تھی جبکہ عقبی سیٹ پر کاٹن کے کلف زدہ بوسکی کلر کے سوٹ میں ملبوس ایک خوب صورت جوان پورے کروفر کے ساتھ براجمان تھا۔ وہ کافی دیر سے سفر میں تھے۔ لاہور سے چلے ہوئے انہیں تقریباً چار گھنٹے ہو چکے تھے کیونکہ ان کی

گاڑی ٹھیک نو بجے لاہور سے نکلی تھی اور اب تقریباً ایک بجنے والا تھا۔
سنہری بالوں والی لڑکی بڑی مہارت سے گاڑی ڈرائیو کر رہی تھی اور ان کا اپنی منزل سے فاصلہ تیزی سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر لڑکی نے ایک سائیڈ پر اچانک گاڑی سڑک سے نیچے اتار لی اور اطمینان سے سامنے نظر آنے والے ڈرائیور ہوٹل کی پارکنگ میں جا روکی۔

''کیا ہوا......؟ یہاں کیوں رُک گئیں......؟'' کاٹن کے سوٹ والا جو یقیناً خالد گجر تھا اور سنہرے بالوں والی لڑکی شیزہ کے علاوہ اور کوئی نہیں تھی، اس سے مخاطب ہوتے ہوئے بولا۔

''سر پیٹ میں چوہے دوڑ رہے ہیں اور لنچ کا وقت بھی ہوگیا ہے تو میں نے سوچا کچھ کھا ہی لیا جائے۔''

وہ اطمینان بھرے انداز میں دروازہ کھول کر نیچے اترتے ہوئے بولی تو خالد بھی دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا اور وہ دونوں ہوٹل میں جا بیٹھے جلد ہی ان کی مرضی کا کھانا سرو ہوگیا اور وہ کھانا کھانے لگے۔

''سر......! بھوک بھی لگ رہی تھی لیکن اصل بات یہ ہے کہ میں مسلسل ڈرائیونگ کرتے کرتے تھک بھی گئی تھی۔ سوچا کھانا بھی کھا لیں اور کچھ ریسٹ بھی مل جائے گا۔'' شیزہ نے وضاحت آمیز انداز میں کہا تو خالد نے جواب دیا۔

''ہاں ہاں......! کوئی بات نہیں...... آرام سے کھانا کھاؤ......!''

''سر......! آپ خود ڈرائیونگ کیوں نہیں کرتے......؟'' شیزہ نے اچانک سوال کیا۔

''نا بھئی نا......! میں ابھی اتنا ایکسپرٹ کہاں ہوا ہوں کہ مین روڈ پر ڈرائیو کر سکوں......؟'' خالد نے گھبرا کر کہا۔

''لیکن سر......! اس طرح تو آپ کی جھجک کبھی نہیں دور ہوگی۔ آپ گاڑی چلائیں گے تو ہی اعتماد پیدا ہوگا نا......!'' شیزہ نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے

کہا۔

''ہاں......! بات تو تمہاری بھی ٹھیک ہے لیکن مین روڈ پر تو یہ رسک نہیں لیا جا سکتا نا......؟'' خالد نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کیا تو شیزہ دوبارہ گویا ہوئی۔

''کچھ نہیں ہوتا......آپ چلا سکتے ہیں گاڑی...... میں ہوں نا......آپ کے ساتھ......بس اب گاڑی آپ ہی ڈرائیو کریں گے۔''

اس کا انداز فیصلہ کن تھا پھر اس نے چابی خالد کی طرف بڑھائی تو خالد نے جیسے ہتھیار ڈال دیئے اور بادل ناخواستہ چابی پکڑ لی۔ کھانا کھا کر وہ اٹھے تو کاؤنٹر پر بل ادا کرتے وقت شیزہ نے اپنا موبائل کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ بل ادا کرنے کے بعد دونوں گاڑی تک آئے۔

خالد نے ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولا اور سیٹ پر بیٹھ گیا۔

''اوہ......! سر......! میں اپنا موبائل تو وہیں بھول آئی۔ آپ بیٹھیں میں موبائل لے کر ابھی واپس آئی۔'' اور پھر وہ پلٹ کر تیزی سے کاؤنٹر کی طرف بڑھ گئی اور پھر کاؤنٹر سے موبائل اٹھاتے ہوئے کاؤنٹر کلرک سے بولی۔

''یہ ہمارے سر بھی نا......! آدھے پاگل ہیں۔ ڈرائیونگ آتی نہیں اور ضد کر رہے ہیں گاڑی میں چلاؤں گا۔ کیا کریں......؟ نوکری تو کرنی ہی ہے......؟''

اور بے چارہ کاؤنٹر کلرک کوئی جواب دیئے بغیر خوش اخلاقی سے مسکرا کر رہ گیا۔

وہ موبائل اٹھانے کے بعد واپس گاڑی میں آ بیٹھی۔ خالد نے گاڑی اسٹارٹ کر کے آگے بڑھائی تو شاید کلچ یک دم چھوڑ دیا۔ گاڑی کس بدمست ہاتھی کی طرح ایک جھٹکے سے آگے بڑھی اور بری طرح لہراتے ہوئے تیزی سے سڑک کی جانب چلتی چلی گئی۔ ہوٹل کے ملازمین بمعہ کاؤنٹر کلرک حیرت سے ڈرائیونگ کے اس عالی شان مظاہرے کو دیکھ رہے تھے۔

گاڑی سڑک پر آ چکی تھی اور تیزی سے سامنے سے آتے ہوئے ٹرک کی

طرف بڑھ رہی تھی۔ ٹرک اور گاڑی کے درمیان فاصلہ تیزی سے کم ہوتا چلا جا رہا تھا۔ جونہی گاڑی ٹرک کے قریب پہنچی تو خالد نے تیزی سے اسٹیرنگ گھما دیا اور گاڑی بمشکل چند انچ کے فاصلے سے بائیں سمت ہوئی اور زن کی آواز کے ساتھ ٹرک کے قریب سے آگے نکلتی چلی گئی۔

''بس سر......! سائیڈ پر کر کے بریک لگا دیں۔ میں خود ہی ڈرائیو کرتی ہوں۔'' عقبی سیٹ سے شیزہ کی آواز بلند ہوئی تو خالد نے اس کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے گاڑی ایک سائیڈ پر روک دی۔ پھر گاڑی دوبارہ آگے بڑھی لیکن اب ان کی نشستیں تبدیل ہو چکی تھیں۔ ڈرائیونگ سیٹ پر شیزہ اور عقبی سیٹ پر خالد براجمان تھے۔

گاڑی اپنی پوری رفتار سے بھاگتی چلی جا رہی تھی اور اس کے عمل کا وقت شروع ہونے میں زیادہ دیر باقی نہیں تھی کیونکہ جلد ہی اسے پل کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ اس کے ہونٹوں پر چپکی وہ مخصوص طنزیہ مسکراہٹ مزید گہری ہوگئی۔ اس کے ہاتھ اسٹیرنگ وہیل پر مضبوطی سے جم گئے۔

شیزہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ نہر بہت چوڑی اور گہری ہے۔ جونہی گاڑی پل کے قریب پہنچی تو شیزہ نے یک لخت اسٹیرنگ وہیل گھما دیا اور گاڑی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی مانند تیزی کے ساتھ سڑک سے اتری اور نہر کی پٹڑی پر چڑھ کر نہر کے متوازی دوڑنے لگی۔ گاڑی نے بری طرح جھٹکے اور ہچکولے کھائے تھے اور عقبی نشست پر بیٹھا خالد گڑبڑا کر رہ گیا تھا۔

''کک...... کک...... کیا کر رہی ہو......؟ ادھر کہاں جا رہی ہو......؟''

خالد نے گھبراہٹ آمیز آواز میں پوچھا لیکن شیزہ خاموش رہی۔ بس اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کچھ مزید گہری ہوگئی۔

اس دوران گاڑی نہر کے ساتھ ساتھ کافی فاصلے تک آ پہنچی تھی۔ شیزہ نے ایک مرتبہ پھر یک لخت اسٹیرنگ گھما دیا لیکن اس دوران وہ اپنی سائیڈ کا دروازہ

کھولنا نہیں بھولی تھی۔ گاڑی ہوا میں بلند ہوئی اور ایک چھپاکے کی آواز کے ساتھ نہر میں جا گری اور پھر تیزی سے پانی میں ڈوبتی چلی گئی۔

جبکہ گاڑی سے کچھ ہی فاصلے پر ایک نسوانی وجود تیرتا ہوا نہر کے کنارے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ کنارے پر چڑھنے کے بعد اس نے پلٹ کر نہر کی طرف دیکھا۔ گاڑی ڈوب چکی تھی اور اب اس کا نام و نشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی وہی مخصوص اور طنزیہ مسکراہٹ پھر وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

''سر......! عادتیں تو میں نے اپنی بدل لیں...... لیکن اس کے لئے بہت کچھ بدلنا ضروری تھا...... بہت کچھ......!''

☆☆☆

خالد گجر کے آفس میں اس وقت کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ خالد گجر کی لاش دریافت کی گئی تھی اور ویسے بھی جہاں گاڑی گری تھی، شیزہ نے اس جگہ کی مکمل نشان دہی کر دی تھی۔ لہٰذا دوسرے ہی دن خالد کی لاش برآمد کر لی گئی۔ پولیس مصروف تفتیش تھی۔ گاڑی گرنے کے حادثے کے بعد شیزہ انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اسی ہوٹل پہنچی تھی جہاں سے انہوں نے کھانا کھایا تھا۔

شام کے سائے اپنے پر پھیلا چکے تھے اور سورج اپنا سفر تمام کرنے کے بعد دن بھر کی تھکن اوڑھے افق کی گود میں محو خواب ہو چکا تھا۔ شیزہ کا لباس بری طرح پانی اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے اور پاؤں میں جوتے تک نہیں تھے۔ وہ شاید پیدل چلتی ہوئی وہاں تک پہنچی تھی۔

ہوٹل کے تمام ملازمین اور کاؤنٹر کلرک حیرت اور استعجاب کی حالت میں اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ لڑکھڑاتی ہوئی سیدھی کاؤنٹر کی طرف بڑھی اور پھر دونوں ہاتھ کاؤنٹر پر ٹکا کر جیسے اپنے پورے وجود کا بوجھ کاؤنٹر پر منتقل کرتے ہوئے لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں بولی۔

''آپ گواہ ہیں اس کے، میں نے سر کو منع کیا تھا کہ اگر آپ کو ڈرائیونگ نہیں کرنا آتی تو آپ گاڑی مت چلائیں لیکن انہوں نے میری ایک نہیں سنی اور وہ یہیں سے انتہائی رف ڈرائیونگ کرتے ہوئے نکلے تھے اور...... گاڑی نہر میں جا گری۔'' اس نے سسکیاں لیتے ہوئے اپنا جملہ مکمل کیا اور پھر لڑکھڑا کر دھڑام سے نیچے جا گری۔ وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

ہوٹل انتظامیہ میں بھگدڑ سی مچ گئی اور کاؤنٹر کلرک اس کی ساری بات سننے کے بعد حیرت سے منہ کھولے کھڑا تھا۔ جلد ہی پولیس کو اطلاع کر دی گئی اور شیزہ کو یک چارپائی پر منتقل کر دیا گیا۔ پولیس آئی تو ہوٹل والوں کے بیان شیزہ کو بے گناہ ثابت کرنے کے لئے کافی تھے شیزہ نے بھی یہی کہا۔

''انہیں ڈرائیونگ نہیں آتی تھی لیکن انہوں نے ضد کر کے گاڑی چلائی اور نتیجتاً گاڑی نہر جا کر گری۔ وہ بمشکل تمام نہر سے اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئی۔'' شیزہ کی معصومیت اس کے صنف نازک ہونے کی رعایت اور ہوٹل والوں کے بیان کی روشنی میں پولیس والے اس کی باتوں پر ایمان لے آئے۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے۔ شیزہ نے نہر کے کنارے پر بیٹھ کر پورے دو گھنٹے انتظار کیا تھا اور اس کی نظریں بہتے پانی پر جمی رہی تھیں۔ دو گھنٹے بعد وہ دوبارہ پانی میں داخل ہوئی تھی۔ کسی ماہر تیراک اور غوطہ زن کی مانند وہ سیدھی گاڑی تک پہنچی اور پھر دوبارہ گاڑی کے اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے عقبی نشستوں کے درمیان میں پھنسی ہوئی خالد کی لاش کو جیسے تیسے کھینچ کر ڈرائیونگ سیٹ پر بٹھایا۔ پانی کے اندر زور لگا کر ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کیا اور پچھلا دروازہ جہاں سے اس نے خالد کو باہر نکالا تھا، بدستور کھلا رہنے دیا۔

اس تمام کارروائی کے دوران اس کا سانس بری طرح پھول چکا تھا۔ وہ جلدی سطح آب پر بلند ہوئی اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ آکسیجن کی مناسب مقدار پھیپھڑوں تک پہنچی تو اس کے اوسان قدرے بحال ہو گئے۔

اب وہ تیرتی ہوئی کنارے کی طرف جا رہی تھی۔ کنارے پر پہنچ کر اس نے خود کو اچھی طرح کیچڑ میں لت پت کیا۔ چند لمحے سانس درست ہونے کا انتظار کیا پھر ہوٹل کی طرف روانہ ہوگئی تھی اور اب وہ چہرے پر معصومیت سجائے بے بسی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کے سامنے پنجاب پولیس کا ایک سب انسپکٹر ہے۔ کوئی شرلاک ہومز نہیں سو وہ اپنی کارروائی پر مطمئن تھی۔

اس وقت پولیس پارٹی ان کے آفس میں موجود تھی اور تمام اسٹاف کے بیانات قلم بند کئے جا رہے تھے جن کی روشنی میں پولیس کو پتا چلا کہ تین چار دن پہلے خالد اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا جما جمایا بزنس لاہور کے کسی بزنس مین سعید جمالی کو فروخت کر چکا تھا۔ پیمنٹ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل ہو چکی تھی۔ ایگریمنٹ سائن کرنے کے لئے اسے لاہور جانا تھا اور وہاں سے واپسی پر اپنا یہ دفتر بمعہ اسٹاف کے سعید جمالی کو ہینڈ اوور کر دینا تھا۔

لاہور روانہ ہونے سے قبل خالد نے تمام اسٹاف کو جمع کر کے تفصیل سے ہر بات بتائی تھی اور پھر سب سے دریافت کیا تھا کہ کسی کو ڈرائیونگ آتی ہے لیکن ڈرائیونگ سوائے شیزہ کے کسی کو نہ آتی تھی۔ لہٰذا شیزہ اس کے ہمراہ گئی تھی۔ اسٹاف کے کسی ممبر نے ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا جس سے شیزہ پر کسی قسم کا کوئی شبہ کیا جا سکتا۔ لہٰذا وہ پولیس کی گرفت میں آنے سے محفوظ رہی۔

☆☆☆

سرخ و سپید رنگ، کن پٹیوں پر سفید بال، بھاری بھرکم وجود، موٹی موٹی آنکھیں جن میں ذہانت کی چمک اور کشادہ پیشانی والے یہ شخص سعید جمالی تھے۔ آفس جوائن کئے ہوئے آج انہیں تقریباً ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ انہوں نے اپنے دفتر کے فرنیچر میں اور اس کی ترتیب میں کافی تبدیلیاں کروائی تھیں۔ لیکن خالد گجر کی تصویر کو وہاں سے نہیں ہٹایا گیا تھا۔

اس دوران وہ پولیس کی تمام تر کارروائی سے باخبر رہے تھے اور ان

حادثے کی پوری تفصیل سے واقف ہو چکے تھے۔ وہ اپنے اسٹاف سے بہت جلد گھل مل گئے تھے۔ اپنے اسٹاف سے انہیں شیزہ کے بارے میں کافی عجیب اور مختلف قسم کی معلومات ملی تھیں۔

انہوں نے خود بھی شیزہ پر توجہ دی تو محسوس کیا کہ اس لڑکی میں کچھ نہ کچھ اسرار ضرور تھا اس کی روٹین اب بھی وہی تھی۔ وہ اب بھی اپنی مرضی سے آفس آتی تھی اور ہمیشہ دیر سے آتی تھی۔

آج بھی جب سعید جمالی اپنی مخصوص نشست تک پہنچے تو شیزہ حسب معمول اپنی سیٹ پر موجود نہیں تھی کیونکہ ابھی اس کے آنے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے بیل بجائی تو چپڑاسی چراغ کے جن کی طرح نمودار ہو گیا۔

''یس سر......!'' اس نے بے اختیار پوچھا تھا اور انداز بالکل الہ دین کے چراغ کے جن کا سا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

''کیا حکم ہے میرے آقا......!''

''چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان کو بلاؤ......!'' سعید جمالی گویا ہوئے تھے اور پڑاسی پلٹ کر باہر نکل گیا۔ چند لمحوں میں ہی اشرف خان آن پہنچا۔ وہ دبلا پتلا ر کھچڑی بالوں والا مرنجان مرنج قسم کا آدمی تھا لیکن سعید جمالی کو آفس کے پہلے ن ہی وہ شخص پسند آ گیا تھا۔ پڑھا لکھا، حاضر جواب مگر اپنے کام سے کام رکھنے لا شخص تھا۔

''تشریف رکھئے اشرف صاحب......!'' سعید جمالی نے سامنے موجود ست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تو اشرف خان ان کی ٹیبل کی دوسری ف موجود کرسی گھسیٹ کر اس پر بیٹھ گئے۔ اپنے ہاتھوں میں موجود فائلوں کا پلندہ بل پر منتقل کر چکا تھا۔ سعید جمالی کی تجربہ کار نگاہیں اشرف خان کی سوالیہ نظروں ٹکرائیں تو ان کے ہونٹوں نے حرکت کی اور سرسراتی ہوئی آواز میں ایک سوال کے لبوں سے آزاد ہو گیا۔

''مس شیزہ کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے......؟''

اشرف خان ایک ذرا اپنی سیٹ پر کسمسایا اور پھر اس کے ہونٹوں سے چا

مصرعے آزاد ہوئے۔

خوابوں کی طرح تھا نہ خیالوں کی طرح تھا
وہ شخص ریاضی کے سوالوں کی طرح تھا
اُلجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل ہی نہ پایا
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح تھا

''ہونہہ......!'' سعید جمالی ہنکارا بھر کر رہ گئے۔ پھر وہ دوبار گویا ہوئے۔

''کہاں سے آئی ہے......؟ کہاں رہتی ہے......؟ کچھ اتا پتا......؟ کچھ

معلومات ہوں گی اس کے بارے میں......؟'' ان کے انداز میں تجسس ہی تجسس

تھا۔ اشرف خان نے چند لمحے توقف کیا جیسے ان کے سوال کو سمجھنے کی کوشش کر ر

ہو۔ پھر ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔

''نہیں سر......! اس کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ وہ اچانک آئی ا

پتا نہیں کیسے خالد صاحب نے اسے نوکری پر رکھ لیا۔

خالد صاحب کے علاوہ کسی کو اس کے بارے میں کچھ معلومات نہیں۔ کیون

اس سے ہم کلام ہونے کی جرأت ہی کسی میں نہ تھی۔ شاید خالد صاحب میں ب

نہیں۔ اس بارے میں آفس اسٹاف کا کوئی بھی بندہ آپ کے کسی کام نہیں آ

گا۔ بہت ہی پُراسرار سی لڑکی ہے وہ سر......!''

''ہونہہ......!'' کمرے میں ایک مرتبہ پھر سعید جمالی کا ہنکارا بلند ہوا۔ چ

لمحوں تک وہ کرسی کی پشت پر سر ٹکائے پُرخیال انداز میں جیسے کچھ سوچتے رہے

ان کی آواز بلند ہوئی۔

''ٹھیک ہے......! آپ جا سکتے ہیں۔'' اور اشرف خان ٹیبل پر سے ا

فائلیں اٹھاتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

کچھ دیر تک وہ خواہ مخواہ ادھر ادھر کی فائلیں کنگالتے رہے۔ ان کی پیشانی پر جیسے ان گنت شکنوں کا ایک جال سا بچھ گیا تھا۔ ٹھیک اسی لمحے لیڈیز ہیل کی ٹھک ٹھک کرتی آواز کے ساتھ شیزہ کمرے میں داخل ہوئی اور اطمینان سے اپنی سیٹ کی جانب بڑھ گئی۔ ابھی وہ پوری طرح بیٹھ نہیں پائی تھی کہ سعید جمالی کی آواز بلند ہوئی۔

''مس شیزہ......! یہ آفس ہے، آپ کا گھر نہیں جہاں آپ سب کچھ اپنی مرضی سے کرسکیں۔ ہمارے آفس کا باقاعدہ ایک ٹائم ٹیبل ہے۔ اگر آپ نے جاب کرنی ہے تو آپ کو اسے فالو کرنا پڑے گا۔ اگر آپ نے اپنی عادتیں ترک نہ کیں تو آئی ایم سوری......! کہ مجھے آپ کی یہ سیٹ کسی اور کو دینا پڑے گی۔'' شیزہ نے اطمینان بھرے انداز میں سعید جمالی کی پوری بات سنی تھی۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

''مسٹر جمالی......! میں اپنی مرضی کی مالک ہوں۔ میں یہاں جاب کرتی ہوں آپ کی زرخرید غلام نہیں ہوں کہ آپ کی اس لہجے میں کی گئی باتیں سنوں۔ میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

سعید جمالی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا لیکن وہ اپنے کام میں منہمک ہو چکی تھی۔ سعید کے چہرے پر نمودار ہونے والے زلزلے کے سے تاثرات وہ نہیں دیکھ پائی تھی اور سعید جمالی کے دماغ میں جیسے دھماکے ہو رہے تھے۔ ان کے ذہن میں بار بار اس کا یہ جملہ صدائے بازگشت کی طرح گونج رہا تھا۔

''میرا خیال ہے کہ مجھے آپ کے بارے میں بھی کچھ سوچنا پڑے گا۔''

پھر وہ اپنی سیٹ سے اٹھ گئے۔ وہ سیدھے چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان کے کمرے میں پہنچے اور پھر اس کے کمرے میں رکھے ہوئے فون پر ایک نمبر پش کرنے کے بعد ریسیور کان سے لگاتے ہوئے بولے۔

''ہیلو......! ڈی ایس پی ریحان......! میں سعید جمالی بول رہا ہوں۔'' اور

پھر وہ پوری تفصیل سے بات کرتے چلے گئے۔ اور چیف اکاؤنٹنٹ اشرف خان حیرت سے منہ کھولے سنتا رہ گیا۔

کچھ ہی دیر کے بعد پولیس کی سائرن بجاتی ہوئی تین چار جیپیں آن پہنچی تھیں۔ شیزہ کو گرفتار کر لیا گیا اور دوران تفتیش اس نے قبول کر لیا کہ خالد گجر کو اسی نے قتل کیا تھا۔

اسپتال میں کئی دن تک موت وحیات کی جنگ لڑنے کے بعد ہلاک ہونے والی ثریا کی موت کی ذمہ داری بھی اس نے قبول کر لی تھی لیکن سعید جمالی کے ساتھ ساتھ آفس کے تمام افراد کے لیئے یہ انکشاف حد سے زیادہ حیران کن تھا کہ کل تک ان کے ساتھ کام کرنے والی لڑکی ملک کے بہت بڑے صنعت کار اور ارب پتی سیٹھ راشد کی اکلوتی بیٹی تھی۔

☆☆☆

Pakistanipoint
Waqar Azeem
پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام